خسرو نمبر

(153)

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم
خسرو

شبیہ حضرت امیر خسرو

دانی کہ ہستم در جہان من خسرو شیریں بیان
گر نائی از بہر دلم بہر زبان من بیا
(خسرو)

حضرت امیر خسرو کا مزار

پس منظر میں امیر خسرو کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کا مزار پر انوار

حضرت امیر خسرو کے ہمعصر سات بادشاہ

سلطان جلال الدین محمد فیروز خلجی

سلطان غیاث الدین تغلق

قطب الدین مبارک شاہ خلجی

سلطان علاؤ الدین خلجی

عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریۂ ہند امیر خسرو یادگاری ٹکٹ کی رسم اجراء انجام دے رہے ہیں
شری شنکر دیال شرما وزیر مواصلات ٹکٹ کا البم پیش کر رہے ہیں۔

عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریۂ ہند جو قومی تقاریب کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ ہیں امیر خسرو یادگاری جلد کو ملاحظہ فرما رہے ہیں
تصویر میں نواب علی یاور جنگ صدر کمیٹی اور حسن الدین احمد جنرل سکریٹری بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

امیر خسروؒ کے عرس میں شرکت کیلئے آنیوالے پاکستانی زائرین کا پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے واگہ سرحد پر استقبال

تصویر میں پاکستانی زائرین کے قائد اور چودھری طیب حسین خان ایم۔پی چیئرمین پنجاب وقف بورڈ

پیچھے

مولانا خلیل الرحمٰن ممبر پنجاب وقف بورڈ عصمت علی خان صاحب ایڈیشنل سکریٹری۔ جی اے ٹو ڈپٹی کمشنر امرتسر

پاکستانی زائرین کا استقبال کر رہے ہیں۔

حضرت امیر خسرو کی سات سو سالہ تقاریب کمیٹی کے زیرِ اہتمام ۲۳۔۲۴۔۲۵ جنوری ۱۹۷۶ء کو وگیان بھون میں

حضرت امیر خسرو پر بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد

حضرت امیر خسرو پر بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے عالی جناب فخر الدین علی احمد صاحب صدر جمہوریۂ ہند جناب بی۔ ڈی جتی نائب صدر جمہوریۂ ہند دوسرے غیر ملکی معزز شرکا کے ہمراہ تشریف فرما ہیں۔
جناب علی یاور جنگ صدر امیر خسرو قومی تقریب کمیٹی استقبالیہ کلمات فرما رہے ہیں

تصویر میں امیر خسرو قومی تقریب کمیٹی کے اراکین۔ جناب بی۔ ڈی جتی نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ کشمیر سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ جناب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر جناب پروفیسر نور الحسن وزیر تعلیم حکومت ہند جناب یونس سلیم ایم۔ پی جناب حسن الدین احمد بھی موجود ہیں۔

سہ ماہی
اوقاف
مدیر
حکیم اجمل خاں
جلد ——— (۴)
شمارہ ——— (۱)
جنوری، مارچ ۱۹۷۶ء
اس شمارہ کی قیمت - ۶ روپے
مجلس ادارت
مولانا سعید احمد اکبر آبادی
پروفیسر عبد المجید خاں
بیگم صالحہ عابد حسین
مولانا عبد الحمید رحمانی
ڈاکٹر قیام الدین احمد
مولانا خلیل الرحمان
اشتراکات:
سالانہ: ۱۲ روپے
فی شمارہ: ۳ روپے
خط وکتابت کا پتہ
ترسیل زر کا پتہ:
" اوقاف میگزین "
۵۰ سردار پٹیل مارگ، انبالہ کینٹ
سکریٹری پنجاب وقف بورڈ (میگزین)
۵۰ سردار پٹیل مارگ، انبالہ کینٹ

محتویات

مقالات

نظمیں

صفحہ ۱۱۹ سے لے کر ۱۳۰ تک ۔

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر حکیم اجمل خاں نے ہمدرد وقف بورڈ کی جانب سے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر ۵ سردار پٹیل مارگ چانکیہ پوری نئی دہلی سے شائع کیا۔

مدیر

ہندوستانی عوام اور حکومت کے لئے یہ باعث صد افتخار ہے۔ کہ اس سال فارسی زبان کے سب سے بڑے ہندوستانی شاعر حضرت ابوالحسن یمین الدین امیر خسروؒ کی سات صد سالہ یادگار تقریبات نہایت اہتمام سے منائی جا رہی ہیں تقریبات کے انعقاد و اہتمام اور خسرویات کی ترتیب و اشاعت میں جو اہل فن اور دانشور شرکت فرما رہے ہیں مبارک کے مستحق ہیں ۔

سات صد سالہ یادگار تقریبات کے سلسلے میں اب تک جو پروگرام اور کوششیں سامنے آچکی ہیں ۔ ان میں سب سے اہم چیز قومی سطح پر حضرت امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کا قیام ہے ۔ عزت مآب جناب فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند اس کے سرپرست اعلیٰ اور جناب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر صدر ہیں نیز ممتاز قومی رہنما، ارباب نظر ادب و دانشور کمیٹی کے عہدیدار و رکن ہیں ۔ حضرت امیر خسرو کی شخصیت، فن، اور تعلیمات پر روشنی ڈالنے کے لئے کمیٹی کے سامنے وسیع المقام پروگرام ہیں ۔ جنہیں تدریجی طور پر بروئے کار لایا جا رہا ہے ۔

اس کے علاوہ جو مساعی اب تک سامنے آچکی ہیں ۔ ان میں حکومت ہند کی وزارت مواصلات کی جانب سے حضرت امیر خسرو کی ادبی یادگاری ٹکٹ جاری کیا جا چکا ہے ۔ وزارت اطلاعات و نشریات کے ڈی اے، وی، پی کے ہندی، اردو، اور انگریزی میں شاندار باتصویر بروشر شائع کیا ہے، ترقی اردو بورڈ کی کتاب "خسرو شناسی یادگاری مضامین کا مجموعہ" مرتبہ ظ انصاری و ابوالفیض سحر، اور پبلیکیشنز ڈویژن کی جانب سے امیر خسرو پر انگریزی مجموعہ مضامین کی اشاعت خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ۔

نیشنل آرکائز آف انڈیا، اور نیشنل میوزیم نے امیر خسرو کی کتابیں و مخطوطات کی نمائش کا اہتمام کیا ہے ۔ ڈاکٹر ملک محمد کی کتاب "امیر خسرو" (ہندی) جناب ڈاکٹر ظہور الحسن صاحب انصاری کی کتاب "امیر خسرو احوال و آثار" جناب سلیم احمد صاحب کی کتاب "عہد خسرو" اور ایس۔ ایس لامبہ صاحب کی کتاب "ندر خسرو" بھی خسرویات میں شامل اور قابل قدر اضافہ ہیں ۔

ہمارے کئی جرائد نے اس موقعہ پر اپنے خصوصی نمبر شائع کئے جن میں ماہنامہ آجکل نئی دہلی، نیا دور یوپی لکھنؤ، قومی راج مہاراشٹر بمبئی اور برگ آوارہ حیدرآباد خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان اشاعتوں میں حضرت امیر خسرو کی زندگی اور فن پر مختلف محققین نے بھرپور روشنی ڈالی ہے ۔ امسال حضرت امیر خسرو کے سالانہ عرس کی تقریبات حضرت نظام الدین دہلی میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئیں ممتاز ادبا، شعرا، اور رہنمایان کرام نے شاندار خراج عقیدت پیش کیا ۔ پاکستانی زائرین بھی عرس کی تقریبات میں شریک ہوئے جن کا پرتپاک خیر مقدم پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے واگہ بارڈر پر کیا گیا تھا ۔

پنجاب وقف بورڈ نے حضرت امیر خسرو کے مشہور دیوان "بقیہ نقیہ" مرتبہ جناب سید الشاہ القادری کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے ۔ نیز اپنے جریدہ اوقاف میگزین کی اس خصوصی اشاعت کو حضرت امیر خسرو سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کی ہے ۔

اوقاف میگزین کی خصوصی اشاعت کی ترتیب میں یہ ملحوظ رہا ہے ۔ کہ حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور فن کے تمام روشن پہلو قارئین کرام کے سامنے آجائیں ۔

چنانچہ حیات خسرو کے عنوان سے علامہ شبلی مرحوم کا ایک طویل مگر تحقیقی مقالہ شریک اشاعت ہے حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور علامہ مرحوم کا قلم دونوں ہی منفرد ہیں ۔

ممتاز قومی سکالر جناب ڈاکٹر طارا چند آنجہانی جو دکوں سعدی، حافظ، اور فردوسی کی سرزمین میں قیام پذیر رہ چکے ہیں نے حضرت امیر خسرو کی ہندوستانیت، حب الوطنی، وفاداری، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا عمدہ جائزہ لیا ہے ۔

ہمارے دوسرے لکھنے والوں میں ڈاکٹر خلیق احمد نظامی، جناب صلاح الدین عبدالرحمان، جناب نثار احمد فاروقی، جناب حسن الدین احمد، جناب عتیق حنفی، جناب جعفر آہ، جناب محمد عمر جیسے مورخ، نقاد، محقق، مقالہ نگار، ادیب، وغیرہ شریک ہیں ۔ ان مقتدر شرکاء نے اپنے مقالات میں حضرت امیر خسرو کی شخصیت، فن، اور کردار کے مختلف گوشوں پر اچھی اور تحقیقی بحث کی ہے ۔ جسے آپ ملاحظہ فرمائیں گے ۔

حصۂ نظم میں جناب ماہر القادری، ساحر نظامی، سلام مچھلی شہری، جمیل مظہری، سید غلام سمانی، جگن ناتھ آزاد، تسنیم کرانی، مظفر الدین احمد جیسے ممتاز شعرائے کرام شریک ہیں نیز حضرت امیر خسرو کی تقریبات کے سلسلے کی تصاویر بھی شامل کی جا رہی ہیں۔

حضرت امیر خسرو یقیناً اپنے عہد کی بے مثال اور عظیم شخصیت تھے جنہیں انسانیت اور ہر فن کا کمال حاصل تھا۔ آپ ایک طرف حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے ہم نشین تھے۔ اور دوسری طرف اپنے ہم عصر شہنشاہوں کے درباری بھی، فارسی کے شاعر بھی اور ہندوی کے بھی۔ موسیقار بھی تھے اور لغت گو بھی۔ مرثیہ خواں بھی تھے، اور مثنوی نگار بھی! آپ کی انسانیت، اسلامیت اور کمالِ فن کا اعتراف حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے اس طرح فرمایا ہے

جو پوچھے گا خدا روزِ جزا لایا ہے کیا تحفہ
تو کہہ دوں گا، خسرو ہے مرے اعمال کا ثمرہ

فنِ درباری میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ سیر الاولیاء میں امیر خورد نے آپ کے کمالِ فن کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔

"میں نے اپنے والد سے یہ بھی سنا ہے۔ کہ سلطان جلال الدین خلجی اپنے عہدِ دولت میں چاہتا تھا۔ کہ شیخ کبیر حضرت نظام الدین اولیاء سے ملے لیکن باوجود اس خواہش کے اجازت نہ ملی۔ آخر میں اس نے امیر خسرو سے جو اس کے مصحف دار تھے خفیہ طور سے طے کیا کہ بغیر اجازت آپکی خدمت میں آئے۔ امیر خسرو نے یہ مناسب سمجھا کہ اس بات کو اپنے مرشد سے عرض کر دینا چاہئے۔ بادشاہ نے ان سے ایک بات خفیہ کہی تھی لیکن آپ کو خوف تھا کہ آپ نے یہ بات شیخ کبیر سے چھپائی۔ تو وہ آپ سے رنجیدہ ہو جائیں گے کہ تم کو معلوم تھا تم نے مجھے کیوں نہیں آگاہ کیا۔ اس لئے امیر خسرو نے اپنی جان پر کھیل کر شیخ کبیر کو اطلاع دی۔ کہ کل بادشاہ آپ سے ملنے آئے گا۔ حضور دوسرے ہی روز شیخ فرید کی زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب بادشاہ نے یہ سنا۔ تو امیر خسرو سے رنجیدہ ہوا۔ کہ تم نے میرے بھید کو کیوں ظاہر کر دیا۔ اور مجھے سعادتِ پائے بوسی سے محروم رکھا۔ امیر خسرو نے جواب دیا کہ بادشاہ کی خفگی سے خوفِ جان ہے۔ لیکن شیخ کی خفگی سے ایمان ضائع ہونے کا خوف ہے۔ بادشاہ مردِ دانا تھا اس نے اس جواب کی تعریف کی۔"

قصیدہ گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا جس کی مثال ملک علاء الدین کشلی خاں عرف ملک چھجو کی شان میں لکھا گیا یہ مشہور قصیدہ ہے۔

چرخ را گفتم کہ خورشیدت کجاست   آسماں روئے ملک چھجو نمود

آپ انتہائی پُر درد اور پُر سوز مرثیہ نگار تھے۔ سلطان محمد کی شہادت پر آپ نے ایک مرثیہ اسپ نامہ مرتب کر کے سنایا۔ جسے سن کر سامعین ہوش و حواس گم کر بیٹھے۔ ہندوستان کی فارسی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اتنا مقبول مرثیہ نہیں لکھا گیا۔

شہ دریں ہند سرو آگہ لبے کہ تقدیر خدا   صوبہ ہند بر را خط سیب در کشید

اس مرثیے کے بعد آپ کی غیر معمولی مقبولیت شروع ہوئی۔ پھر قران السعدین لکھی تو ملک الشعراء بن گئے۔ اور جب جلال الدین خلجی کے کارناموں پر مفتاح الفتوح ترتیب دی تو امیر کا خطاب مل گیا۔ ایک اندازے کے مطابق حضرت امیر خسرو نے چار لاکھ اشعار کہے ہیں۔ اشعار کی اتنی بڑی تعداد ابھی تک کہاں بھی نہیں ملی۔ پھر اشعار بھی ہر قسم کے! جن سے مورخین تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ ادیب فن کی باریکیاں نکالتے ہیں۔ صوفیا سلوک کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ موسیقار سُر دُھن کے انداز تلاشتے ہیں۔ اور وہ کار انگشت بدنداں ہیں کہ

دانی کہ ہستم در جہاں من خسرو شیریں بیاں
گر نائی از بہر دلم، بہر زبانِ من میا

امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کے صدر، اور اراکین اس بات کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کی اس عظیم شخصیت حضرت امیر خسرو کی حیات اور فن پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کے انعقاد کا اہتمام وگیان بھون نئی دہلی میں کیا جس میں سینکڑوں ملکی و غیر ملکی ادیب، دانشور اور رہنما شریک ہوئے۔ کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ عزت مآب فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند نے اس سیمینار کا افتتاح فرمایا جو بہت کامیاب رہا۔

ہمارا خیال تھا۔ کہ ہم اس سیمینار کے مبارک موقعہ پر اوقاف کی اس اشاعتِ خاص کو قارئین کرام اور سیمینار کے شرکاء کی خدمت میں پیش کر سکیں گے۔ مگر افسوس اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔

میں جناب حسن الدین احمد صاحب سکریٹری حضرت امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کا شکر گذار ہوں۔ کہ آپ نے اوقاف کی خصوصی اشاعت حضرت امیر خسرو نمبر کے لئے ہمیں متوجہ کیا۔ اور اس کے لئے مضامین و تصاویر کا انتخاب و اہتمام بھی فرمایا۔

اوقاف میگزین کی یہ اشاعتِ خاص اپنے موضوع پر ہرگز کوئی معرکہ نہیں ہے۔ لیکن خضرِ راہ کا کام ضرور دے سکتی ہے۔ امید ہے کہ شائقین ہماری اس حقیر پیشکش کو قبول فرمائیں گے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ

ولادت و تعلیم

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے۔ حضرت امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں۔ ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے۔ ترکستان میں ایک شہر کش ہے۔ وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے[1]۔ فرشتہ۔ اور دولت شاہ نے لکھا ہے بلخ کے امرا میں سے تھے۔ چنگیز خان کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوئے۔ محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا۔ ایک مہم میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے۔

لیکن صاحب بہارستان سخن۔ تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا غلط ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں۔

پس آنچہ دولت شاہ در تذکرۂ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در
در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را از حق دے نعائد
فرا است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادۂ سلطان
محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بعلت اشتراک رسمی محمد تغلق
خیال کردہ شد

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے۔ اعز الدین علی شاہ حسام الدین اور امیر خسرو۔ سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر صاحب کی عمر ۷ برس کی تھی۔ امیر صاحب کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اور دس ہزار فوج کے افسر تھے۔ امیر صاحب [illegible]ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے۔

مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا۔ مجذوب صاحب کے کمالات کا ہم انکار نہیں کرتے۔ لیکن ان کے مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے۔ خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت۔

جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر صاحب کو حرف لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی۔ جو کچھ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے۔ اور وصلیوں پر اسی کی مشق کرتے تھے۔ خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے۔ وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کو بلا لیا کرتے تھے۔ ایک دن بلایا تو امیر صاحب بھی ساتھ گئے۔ خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عز الدین تشریف رکھتے تھے۔ سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ موزوں کر رہا ہے معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے کہ نہیں؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سن لیجئے۔ خواجہ عز الدین کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ امیر صاحب کو دی کہ کوئی شعر پڑھو۔ امیر صاحب نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا۔ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور سب نے تحسین کی۔ ان کے استاد نے کہا شعر گوئی میں امتحان لیجئے۔ خواجہ عز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو۔ مو۔ بیضہ۔ تیر۔ خربزہ۔ امیر صاحب نے برجستہ کہا۔

ہر موئے کہ در دو زلف آن صنم است
صد بیضۂ عنبرین بران موئے ضم است
چون تیر مدان راست دلش را زیرا کہ
چون خربزہ دندانش درون شکم است[3]

---

[1] دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو باپ کے ساتھ ترکستان کے اطراف سے ہندوستان میں آئے اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں امیر خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے۔ تمام واقعات تاریخ سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان رہیں لیکن دولت شاہ سمرقندی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا۔ اب اٹہ ہے کسی زمانہ میں دریائے گنگ اس کے نیچے بہتا تھا اب میلوں کا فاصلہ ہے۔ یہاں اب اسٹیشن بھی ہے۔

[3] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔

خواجہ عز الدین کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا خسرو۔ باپ کا نام پوچھا انھوں نے اصل نام کے بجائے عرف کا نام بتایا یعنی لاچین۔ خواجہ صاحب نے مزاحاً کہا لاچین یعنی "چین نہیں" پھر کہا "ترک خطا است" یعنی ان کو ترک کہنا خطا ہے؟ انھوں نے اسی فقرہ کو الٹ کر کہا "نے خطا ترک است" یعنی قطعاً وہ ترک ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے اس لئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہیے۔ چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔

امیر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم کی تحصیل تمام کی لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵ یا ۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم دینیہ سے فارغ ہو چکے تھے۔

درباری تعلقات

امیر خسرو صاحب سن رشد کو پہنچے تو دہلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن جلوہ افروز تھا۔ جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا۔ اس کے امرائے دربار میں سے کشلو خاں معروف بہ چھجو بڑے رتبہ کا امیر اور زیادہ سلطان کا بھتیجا اور دربار کے عہدے پر مامور تھا۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ اور مصر۔ شام۔ روم۔ بغداد عراق خراسان ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

امیر صاحب کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے سب سے پہلے اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں۔

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح — ہمدمی با عنبر نابود بود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست — آسماں روئے ملک چھجو نمود

امیر صاحب نے مثنوی سپہر میں لکھا ہے۔

ز شاہاں کسے کاو علم کرد بار — معز الدنیا بود سے کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی ادب پروری پر حرف نہیں آتا۔ کشلو خاں امرا میں سے تھا۔ بادشاہ نہ تھا۔ بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر صاحب کی قدردانی کی وہ معز الدین کیقباد تھا۔ امیر صاحب اکثر کشلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لے جاتے اور مجلس گرم کر دیتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے۔ امیر صاحب نے اپنی زمزمہ سنجی سے وہ سماں باندھا کہ بغرا خاں بہت متاثر ہوا اور صلہ کے طور پر کشتی بھر کر روپے دیئے۔ کشلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستہ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوتے۔ امیر صاحب نے اس کے بعد بارہا مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی لیکن کشلو خاں کے دل سے یہ بات نہ نکلی۔

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا۔ امیر صاحب نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا۔ بغرا خاں نے بہت قدردانی کی اور ندیم خاص بنایا۔ اسی زمانہ یعنی ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔ بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا۔ امیر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دہلی واپس آیا اور بنگال کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی۔ امیر صاحب کو اب زمانہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا۔ دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے۔ لیکن وہ دہلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ رخصت لے کر دہلی میں آئے اتفاق سے اسی زمانہ میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دہلی میں آیا تھا۔ وہ نہایت فاضل۔ صاحب علم۔ فیاض اور قدردان علم و فن تھا۔ تمکین و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ۔ دیوان خاقانی۔ انوری۔ خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بیاض جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کئے تھے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے۔ یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص [illegible]

---

۱ یہ تمام حالات امیر صاحب نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں۔ ۲ چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ ایک شخص نہ تھا کئی ہیں۔ امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں بادشاہی دربار کے تعلق سے پہلے خان معظم کشلو خاں ملک چھجو کے دربار میں پہونچا اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں۔ بدایونی (منتخب التواریخ جلد اول) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ اور سلطان معز الدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد بن اعز الدین سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا۔ سلطان نے اس کو بار بک مقرر کر کے خان اعظم کشلی خان کا خطاب دیا۔ بدایونی ص ۱۲۴ میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ اس کو کشلو خاں خطاب ملا تھا۔ ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین کشلو خاں چھجو ایک ہی شخص ہیں۔

۳ یہ تمام حالات خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ ۴ تاریخ فرشتہ ۵ امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے۔ اور ایک سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے۔

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں۔ امیر صاحب کو بلا کر خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ امیر صاحب نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی جس میں باپ بیٹے کی مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس وقت امیر صاحب کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور ۶۸۸ھ تھا جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

ساخت گشت از روی جامہ ۔ از پس شش ماہ چنیں نامہ
در رمضان شد بسعادت تمام ۔ یافت قران نامہ سعدین نام
آنچہ تاریخ ز ہجرت گذشت ۔ بود شش صد و ہشتاد و ہشت
سال من ار مرد را اگر برسی ۔ راست بگویم بہ شش بود و سی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مر گیا یا مارا گیا اس کے بعد اس کا تین سالہ بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا وہ بالکل بچہ تھا تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اتار کر قید کر دیا۔ اب خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا۔ اس لئے ترکی امرائے دربار میں سے ملک فیروز شائستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔ اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا۔ تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ بڑے عطیے دار اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی نہایت صاحب مذاق۔ رنگین طبع۔ خوش صحبت تھا شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں۔

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم ۔ واں روئے چو گلزارت بے پردہ نمی خواہم
بے چہرہ پر سبزت خواہم یک سر کنار آئی ۔ ہاں نگہ مقدس ال پوشیدہ نمی خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے۔ سب فاضل۔ اہل فن موزوں طبع اور رنگیں مزاج تھے۔ مثلاً ملک تاج الدین کرچی۔ ملک فخر الدین۔ ملک اعز الدین۔ ملک قرابیگ۔ ملک نصرت ملک ضبت۔ ملک کمال الدین۔ ابو المعالی۔ ملک امیر الدین کرانی۔ ملک سعد الدین۔ انہیں اور ہم صحبت تھے۔

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے چنانچہ تاج الدین عراقی۔ خواجہ حسن دہلوی۔ موید جاجرمی۔ موید دیوانہ۔ امیر ارسلان ۔ ۔ اختیار الدین باغی۔ ندمائے خاص میں تھے۔ ساقی۔ مغنی۔ اور مطرب بھی وہ لوگ تھے مثلاً امیر خاصہ۔ حمید۔ راجہ۔ نظام۔ محمد شاہ۔ نصرت خاں۔ شہزور۔

ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر صاحب سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا وہ عالم بھی تھے۔ فاضل بھی۔ صوفی بھی۔ مطرب بھی۔ اور شاعر تو تھے ہی۔ معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا اسی وقت اس نے امیر صاحب کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کر کے خاص التفات عنایت کیا تھا تخت پر بیٹھا تو امیر صاحب کو ندیم خاص بنایا اور مصحف[2] داری اور نظارت کا عہدہ دیا۔ اس کے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا ان کے لئے مقرر کیا۔ امیر صاحب امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

امیر صاحب نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے اور تاج الفتوح نام رکھا۔ اس کی تفصیلی کیفیت آگے آئے گی۔ جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرا دیا۔ اور خود تخت نشین ہوا۔ سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ جہالت و لی اور سفاکی اس کی طبیعت کا جوہر تھا۔ تاہم بہت بڑے عزم و استقلال۔ شوکت و شان کا فرمانروا گذرا ہے بعض اکثر فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی قدردانی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ اس کا دربار بقول برنی علماء فضلاء شعراء سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں[3]۔

قاضی فخر الدین ناقلہ۔ قاضی فخر الدین کرمانی۔ مولانا نصیر الدین غنی۔ مولانا تاج الدین مقدم۔ قاضی ضیاء الدین۔ مولانا ظہیر الدین لنگ۔ مولانا ظہیر الدین بھکری۔ قاضی رکن الدین ناقلہ۔ مولانا سرکتی۔ مولانا نصیر الدین رازی۔ مولانا علاء الدین، مقدر تربیت۔ مولانا اسراں بابک کلہ۔ مولانا حمیت الدین سالوی۔ مولانا شمس الدین۔ مولانا صدر الدین۔ مولانا علاء الدین لاہوری۔ قاضی شمس الدین کازرونی۔ مولانا شمس الدین یحییٰ۔ مولانا شمس الدین۔ مولانا صدر الدین پادہ۔ مولانا معین الدین لونی۔ مولانا افتخار الدین رازی۔ مولانا معز الدین اندرپتی۔ مولانا نجم الدین۔ مولانا حمید الدین ملوری۔ مولانا علاء الدین کرک۔ مولانا حسام الدین سادہ۔ محی الدین کاشانی۔ مولانا کمال الدین کولوی۔ مولانا وجیہ الدین کاملی۔ مولانا مصباح الدین۔ مولانا نظام الدین کلالی۔ مولانا نصیر الدین کرہی۔ مولانا نصیر الدین لحی۔ مولانا علاء الدین تاجر۔ مولانا کریم الدین جوہری۔ مولانا محب ملتانی۔ مولانا حمید الدین۔ مولانا برہان الدین بھکری۔ مولانا افتخار الدین۔ مولانا حمید الدین ملتانی۔ مولانا اکمل محمد شیرازی۔ مولانا حسام الدین سرخ۔ مولانا شہاب الدین ملتانی۔ مولانا فخر الدین ہانسوی۔ مولانا فخر الدین شقاقلی۔ مولانا علیم الدین۔

قراء مولانا شاطبی۔ مولانا علاء الدین مقری۔ خواجہ زکی۔
واعظین مولانا حسام الدین درویش۔ مولانا شہاب الدین۔ مولانا اکرم۔
شعراء خواجہ حسن دہلوی۔ صدر الدین عالی۔ فخر الدین قواس۔ حمید الدین راجہ۔ مولانا عارف عبد الحکیم۔ شہاب الدین۔ لیکن امیر صاحب کے آفتاب کمال نے ان ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر صاحب کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں وہ بھی امیر صاحب ہی کا فیض ہے۔ علاء الدین نے امیر صاحب کا ایک ہزار سالانہ تنکہ[4] مقرر کیا تھا۔ امیر صاحب نے سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا جس کا نام خزائن الفتوح ہے تفصیل آگے آئے گی۔

۶۹۸ھ میں امیر صاحب کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال

---

۱ تاریخ فرشتہ ۲ جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اس کو مصحف دار کہتے تھے۔ ۳ یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے ۴ تاریخ فرشتہ۔ غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا۔

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز اور درد و اثر ان کے کلام میں موجود ہے ان کے کتنے محسن (امیر صاحب) ہی کی ہیں۔

جامعیت کمالات

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع۔ ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی۔ سعدی۔ انوری۔ حافظ۔ عرفی۔ نظیری نے ستہ اقلیم سخن کے علم رکھے ہیں۔ لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ عرفی نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل مثنوی قصیدہ۔ رباعی سب کچھ داخل ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی قطعیں۔ مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ساٹھ ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہے ہیں۔ لیکن امیر صاحب کا کلام بھی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور دہلی کے محاورے میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس قدر ... متن ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرہ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر صاحب کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاشا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے عربی میں اہل عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے ماہر ہیں۔ چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

حس قدرے ز سرایں کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی۔ اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بے کار گیا۔ لیکن ان کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب۔ ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ اس کی تفصیل مستقل عنوان میں آئی ہے۔

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ شعر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا۔

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا۔ تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی۔ یہ کام جو سرد تھا۔ وہ شاعری نہ تھی ملکہ اور اشتغال تھے۔ پہلے مجموعہ کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

مسکین من مستمند مدہوش — از سوختگی چو دیگ پر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام — در گوشہ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رائے — پیش چو خودے ستادہ بر پائے

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں۔

تا خوں نہ رود ز پائے تا سر — دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا۔ کھانا کھانے کو نہیں ملتا۔

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا۔

کمال موسیقی

امیر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا۔ ان کے زمانہ کا مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا نایک گوپال تھا۔ اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح اٹھا کر لے چلتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا۔ امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں۔ نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کی جائے۔ نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا۔ ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا۔ ان سے گانے کی فرمائش کی۔ امیر صاحب نے کہا مغل ہوں۔ ہندوستانی گانا یوں ہی سا جانتا ہوں۔ پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

گوپال نے گانا شروع کیا۔ امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں۔ پھر خود اس کو ادا کیا۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا۔ امیر صاحب نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں۔ غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا امیر صاحب اس کو ایسا ایجاد ثابت کر جاتے تھے۔ بالآخر کہا کہ یہ تمام بازاری راگ تھے۔ اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں۔ پھر جو گانا شروع کیا تو گوپال ..
....مبہوت ہو کر...........

رہ گیا[1]

امیر صاحب چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے واقف تھے اس لئے انہوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دے کر ایک نیا علم پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان کے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[2]

[illegible] جو امیر خسرو کے راگوں سے مرکب ہے۔

مجیر — غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے

سازگری — پوربی، گورا، کنگلی، ایک فارسی راگ۔ قران السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نوازندہ سازگری در عراق کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق

ایمن — ہنڈول اور نیریز

عشاق — سارنگ اور بسنت اور نوا

موافق — ٹوڑی، مالری، دوگاہ، حسینی

غنم — پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے۔

زیلف — کھٹ راگ میں شہناز کو ملایا ہے۔

فرغنہ — کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے۔

سرپردہ — سارنگ بلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے۔

باخرز — دیسکار میں ایک فارسی راگ ملایا ہے۔

فردوست — کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

منم — کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے۔

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے۔ باقی راگوں میں کچھ یوں ہی اول بدل کر کے دوسرا نام رکھ دیا ہے۔ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ۔ یہ سب بھی امیر صاحب کی ایجاد ہیں۔ ان میں سے بعض خاص ان کی ایجاد ہیں۔ بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے۔ امیر صاحب نے ان میں کچھ تصرف کر کے نام بدل دیا۔

تصانیف

جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ امیر صاحب نے خود کسی کتاب میں تحریر کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔

امیر صاحب کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں۔ چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے۔ اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے۔ اس سے ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴۔۵ لاکھ سطریں ہوں۔ تو چنداں تعجب نہیں لوگوں نے بیت اور شعر کو مترادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھ دیا۔ ہندی کلام مدون نہیں ہوا۔ اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے۔ بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دیوان تحفۃ الصغر[3] — اس کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔

دیوان وسط الحیات — اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۲ یا ۳۴ برس تک کلام ہے۔ اس میں جو قصائد ہیں سلطان محمد خان وغیرہ کی مدح میں ہیں۔

غرۃ الکمال — یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا ہے۔ ۳۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۷ھ سے تقریباً ۶۹۰ھ تک کا کلام ہے دیباچہ میں مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے۔ سلطان معز الدین اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں۔ در[illegible] میں اس کی ترتیب دی اور دیباچہ لکھا۔

بقیہ نقیہ — بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اس لئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے۔

نہایۃ الکمال — پانچواں دیوان ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ

---

[1] عالمگیری علماء میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خان تھا۔ ایک مشہور امیر تھا۔ ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے رنگ گفتگوئے طوطی از آئینہ می خیزد مگر ساقد سیف خان راعکس داشت نسبت۔ وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل بھی فقیر اللہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بہت سے فوائد اضافہ کئے اور اس کا نام راگ درپن رکھا چنانچہ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۹ مطبوعہ کلکتہ میں تفصیل مذکور ہے۔ اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آمدہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی نسخہ سے لئے ہیں۔

[2] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں دونوں غلط ہیں اس لئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے۔ اس لئے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے۔

[3] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اور نہایۃ الکمال کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں لیکن اس وقت سامنے نہیں۔ اس لئے ان کی نسبت جو کچھ لکھا ہوں وہ ڈاکٹر نور آر۔ آئی۔ ای۔ ڈی) کے انگریزی سے ماخوذ ہے جو انہوں نے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے کی فہرست میں لکھے ہیں۔ اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر ریڈر [illegible] کالج کا ممنون ہوں۔

مرثیہ اور اس کے دلسوز کی مرثیہ ہیں۔ ایک قطعہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن تاریخ امیر خسرو نے انتقال کیا ہے۔

قران السعدین — سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جب کہ ان کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی۔ کیقباد اور بغرا خان کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے۔

مطلع الانوار — مخزن الاسرار کا جواب ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی۔ ۳۳۱۰ شعر ہیں۔ دو ہفتہ میں تمام ہوئی سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے

شیریں خسرو — بعد ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی۔ ۴۱۲۴ شعر ہیں

سکندر نامہ کا جواب ہے۔ سال اختتام ۶۹۹ھ ہے۔ اشعار کی تعداد ۴۴۵۰۔

لیلیٰ مجنوں — ۲۶۶۰ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔

ہشت بہشت — سلسلۂ پنج گنج کی سب سے آخر مثنوی ہے۔ ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے۔ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۵۲ شعر ہیں۔

پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں۔ خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں۔ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت تمام ہوئیں۔

مفتاح الفتوح — سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں۔ اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی مطلع یہ ہے۔

سخن بر نام شاہے کردم آغاز

نہ سپہر — قطب الدین خلجی کے نام پر ہے نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی۔ ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی۔

دول رانی اور خضر خاں — دیول رانی۔ گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی۔ خضر خاں سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا۔ وہ دیول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے اس کی فرمائش سے امیر صاحب نے اس کو نظم کا لباس پہنایا اور عشقیہ نام رکھا۔ چار مہینے میں تمام ہوئی۔ ۴۲۰۰ شعر تھے۔ خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔

افضل الفوائد — خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں۔

اعجاز خسروی — نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں اور سینکڑوں صنعتیں ایجاد کی ہیں۔ ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی تین جلدوں میں ہے۔

تغلق نامہ — غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں

خزائن الفتوح — سلطان علاء الدین کے فتوحات ہیں۔

مناقب ہند — تاریخ ہند

ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب۔ اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں۔

شاعری

امیر صاحب اگرچہ ہندی نژاد تھے لیکن ایرانی شعرا کو بھی ان کی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا طوطی ہند خود ان کا خطاب تھا۔ ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں۔

غزل

خسرو سرو دارم پاسی شکر دادم	کہ کام طوطی ہندوستاں شود شیریں

خواجہ حافظ

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند	زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دہلی میں آئے۔ اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں۔ اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحتہً اس واقعہ سے انکار کیا ہے تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا۔ اور اس قدر تو تمام تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انہوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں ان کی تربیت کی جائے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ برس سے زائد تھی۔

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے۔ عبید ایک شاعر جو امیر کا معاصر ہے کہتا ہے۔

غلط است اے خسرو زار خامی	کہ سکا خورے برونگ نظامی

امیر صاحب کی شاعری قدرتی تھی۔ وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے ان کے باپ دادا۔ شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے۔ تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ ان کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے دیباچۂ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

عیب جہاں نیست کہ بنہفتہ ام   تا بہ تو گوید ہمہ گفتہ ام
چوں ہنرم اندر تلف کان خویش   معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب کسے ہست کہ گوید بار   چوں ہمہ عیب است بگوید بار

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعری کی تین قسمیں ہیں۔ استاد تمام جو کسی طرز خاص کا موجد ہو جیسے حکیم سنائی۔ انوری۔ ظہیر۔ نظامی۔ استاد نیم تمام جو کسی طرز خاص کا موجد نہیں۔ لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے سارق جو اوروں کے مضامین چراتا ہے پھر لکھتے ہیں کہ استادی کی چار شرطیں ہیں۔ طرز خاص کا موجد ہو۔ اس کا کلام شعراء کے انداز پر ہو صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ در حقیقت میں استاد نہیں۔ اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں لیکن دو شرطیں پائی جاتی۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

بندہ را ازاں چہار شرط استادی کہ گفتہ شد۔ اول شرطے کہ ملک طرز
صنعت بحکم ماخترائے کہ در ہوائے قلم جریان یافت کہ چندیں استادان را
متابع کلمات بودہ ام۔

چوں پس رو طرز ہر سوادم   پس شاگردم نہ استادم

شرط دوم آں کہ در بارہ سواد لوے خطا ناشد ازاں بیزدم بہام زد
کہ نظم بندہ اگرچہ متین و روان است۔ اما گاہ گاہ در غزل و شعر تعریف نیز ہم سب
درین دو شرط معترفم کہ از لاف استادی ترو بر حال تو ام ملطانید۔

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے۔ امیر صاحب کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے

امیر صاحب نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصناف سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں تفصیل اس کی یہ ہے۔

غزل   سعدی   مثنوی   نظامی
مواعظ و حکم   سنائی و خاقانی   قصائد۔ رضی الدین نیشاپوری و
کمال الدین اسمٰعیل خلاق المعانی

لیکن بعد میں کون بتلائے، یہ کس کا منہ ہے۔ ہم ادبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قران السعدین [illegible]) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر صاحب نے شعر و شاعری کے متعلق دیوان کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے۔ مصنف فارسی کے حامی بنے ہیں اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں۔

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے اس سے ثابت ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی بھی تبدیلی برداشت نہیں کر سکتے

(۲) عربی زبان میں ایک ایک حرف کے لئے متعدد مرادف الفاظ ہیں اس لئے شاعری آسان ہے۔ ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود سا الفاظ ہیں باوجود اس کے فارسی شعراء پر میدان شاعری تنگ نہیں۔

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے۔ ردیف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ سارے قافیہ پر مدار ہے۔ جس قدر قافیے بنتے جائیں کہتے جاؤ۔ ان سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آ سکتی۔

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے۔ رشیدی اور سوزنی بھی تھے لیکن زبان دانی میں عرب ادبا سے کم نہ تھے۔ فارسی کی وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ اور بہت سی وجوہ ہیں لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے۔

خصوصیات شاعری

امیر خسرو شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی نظامی مثنوی میں انوری اور کمال قصائد میں۔ سعدی و حافظ غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پیچھے پڑ جاتے ہیں بخلاف اس کے امیر صاحب قصائد مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا۔ غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے مقابلہ کرکے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں۔ مثلاً قلم۔ کاغذ۔ کرسی۔ دریا۔ شمع۔ صراحی جام۔ خاص خاص موقعوں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں۔ جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ امیر صاحب نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا انہوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ اور اس کتاب سے ان کا مقصد اس قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

بود در اندیشۂ من چند گاہ   کز دل دانشکدہ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آتش دہم   مجمع اوصاف حلالش دہم
طرز سخن را ز [illegible] نو دہم   سکۂ آں ملک بخسرو دہم

ساقی بیا، کہ جان بسوخت دل ز عشق   گر سوز این کتاب ہمہ فاد نو گرفت

راست کردی ز ابروان محراب   می نماند نماز خواہی کرد

رابمدوی تو - محراب درست کی ہے   معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے)

من آن نیم ترک طناز را بی تماشم   من آن نیم کہ ناز را بی تماشم

سم با و تند جان بہ تمام مستی   تو بودی من آواز را بی تماشم

با صبا خواہ رخ او زلف ور ز لود   امروز کشادہ شد و آفتاب کرد

تو حال من ہم از ین رخ زردیدی   کہ من بر دے تو شتائی تو ام کرد

سالہا شد کہ نام حرف ز گویت   دل ز بر لب بندہ را آہم دم آ ار کیم

ہم از سر بدہ گریہ گرفتار ایک سخن گوئی   تو مدام کوئی لب من گفتار میگویم

مجھ کو معلوم ہے کہ تم یہ کہو گے لیکن میں بات کہتا ہوں

دعوائے خوش بیانی دل خوش کن مکنم   یک بوسہ بر سم ز ن و بالا کلام کن

امیر صاحب نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے۔ مثلاً

اگر کہ او چہ میرود

آن ذکر بہ زن۔ پکارنا۔

گفتار میگویم۔ یوں ہی ایک بات کہتا ہوں۔

بالا کلام کردن۔ کسی کو بات اور بند کرنا۔

اس بات نے بدگمانی کو موقع دیا ہے کہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ چند محاورے ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن چونکہ ہم کو اپنے سمع اور استقرا پر اعتبار نہیں۔ اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے

مسلسل غزلیں

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ قصائد کا موضوع مدح ہے، مثنویاں قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں۔ قطعات میں بھی اندرونی باتیں ہوتی ہیں۔ عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں تو کیونکر کریں۔ اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا رواج بہت کم ہوا۔ امیر صاحب نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے لکھا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

مثلاً عاشق قاصد یا نسیم بہار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

دیکھو کس اشتیاق کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں۔

اے صبا از من بگو کہ جانان چون است   آن گل تازہ و آن غنچۂ خندان چون شد

با کہ می خورد آن ظالم دورے خوردن   آن رخ بر چہ شد آن زلف پریشان چون است

چشم بد دور کہ بیمار نباشد مست است   چشم مکوش کہ بخوابہ کند آن چون شد

روی زلف سے عارک آن ہر دو خوش باد   دل ربوا تا من پہلوی ایشان چون شد

دور باشد کہ بہ م بت دوران زلف بماند   یار سا آن یوسف گم گشتہ زندان چون است

پوچھتے پوچھتے دفعتہً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اماتر کرہ خلاف عاشقی ہے اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس خوبی سے کہتا ہے۔

ہم جان بسر جانان کہ کم و بیش مگوے   گو ہمیں یک سخن راست کہ جانان چون است

یعنی معشوق کی جان کی قسم ادھر ادھر کی باتیں رہنے دے۔ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حال میں ہے

معشوق نے روزہ رکھا ہے۔ اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں ان کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے۔

ماہ من روزہ بہ ماہ شکرستان دارد   اے خوش آن روزہ کہ جان ز حاجبان دارد

لب بے آلودہ زبان بر تنگر دگر کس مست   اے مسلمانان کس روزہ بہ مہمان دار

خط گرد لبش آمد شکر روزۂ خویش   کان لب سر بہ لب چشمۂ حیوان بگار

می خورد آخر ز من پنہان مست   من گر چشم کہ خود او روزہ پنہان دار

جان من گر تو قدم رنجہ کنی بندۂ تو   بدرے آب دو چشم و دل بریان دارد

معشوق بے سروسامان کے ساتھ سوار آرہا ہے۔ عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ سرو کیسی چل رہی ہے؟ کیا پھول خوشبوؤں میں بس کر آرہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آرہا ہے۔ لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا۔ اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہئے۔ ان حالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں۔

کہ می آید چنین بار اے نگر سر من آید   چو گرد راست اسکہ مگر دکہ باجان مشتاق آمد

کہ می بار جست رازکہ ایں عمر آتش شد   کدامین بادمی عنبر کہ بوے یاسمن آمد

بے وآفت تقوی و آخر این بی دانی   کہ در شہر مسلمان یا بد این چنین آمد

بہار آئی ہے۔ عاشق باغ میں جاتا ہے مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں۔ قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے سبزۂ لب جو اور عالم آپ کی سرحال بند ہے۔ قاصد سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر وہ ادھر ادھر کی باتوں میں ٹالنا چاہے تو نہ ماننا۔ جس طرح ہو سکے ساتھ لانا۔ اور اگر مستی میں ہو تو اسی طرح مست اٹھا لانا۔ ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا۔

آمد بہار و سبزہ چمن و لالہ زار خوش   وقتے ست خوش بہار کہ وقت بہار خوش

در باغ یار بر مسلسل زرین بود   مستی خوش ست بادۂ خوش ست و بہار خوش

بانگ مطربے وسترائے و بحر مے   جامے بزیر سایۂ شاخ چنار خوش

اے باد کاہلی مکن بر در دوست بر د   یار ابکس نہ آمدن آن نگار خوش

چیزے دگر مگوے ہمیں گو کہ در چمن   سرو بوس ست و آب خوش و خوشگوار خوش

لہ پیدا کردن۔ ظاہر کرنا۔ ؎ وقتے خوش بودن۔ دعائیہ جملہ ہے۔ یعنی خدا ان کو خوش و خرم رکھے۔

تیرے گھر میں شب صبح رہتی ہے — کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا

زلف تو سیہ چراغ است ہر جا — بسیار در آفتاب گشت است[1]

شنیدم قد در رہ ہے چہ گفتم — کہ زابروئے تو چشم بد و محراب افتاد

صنم مست توکہ ہی بریں بتاں افتاد — تو مگلگری از آلودگی خواب افتاد

ہزار چشم تاریک باشد عاشق چشم — کہ ہرگز آفتاب من درین روزن نمی آمد

پیش تو آفتاب نتواں گفت — روز روشن چراغ نتواں کرد[2]

می روی دگریہ می آید مرا — ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دل من در زلف و روبیت شد اسیر دو جا بگرد — شب ماہتاب و در دودے کہ بجائے در آمد

ربے عمر دراز عاشقاں گر — شب ہجراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے۔

زلف از آں می بر د آں توچ کہ بتہائے غم — گر شود کوتہ از آں جامہ ہو دکشد

یعنی اپنی زلف وہ اس لئے بڑھاتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھا دے۔

راہے است میانے بر دل — ابروئے تو کرمیان کشاد است

یعنی تیری دونوں ابروؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے۔ اس لئے کہ دل لیجانے کے لئے راستہ ہے۔

زلفت سرو باشکر زاں است — کز سر بلندے اوفتادہ است

یک شب زرخ خویش چراغم کرم کن — تا قصۂ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم

(یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کر دو کہ میں اس کی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں)

خانہ چشم من خراب شد است — کہ ز سیلاب خانماں رفتہ است

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکریں لعل تو کان نمک است — گرچہ شکر بمکان نمک است

آب از روئے تو ملاحت اندوز — گرچہ از آب زیان نمک است

خواہی اے جان سرو خواہ بیا تن کن — مرے مستم امروز کہ جاناں اسباب

آمد کہ گرد حسن وے از آسمان سوال — برخاست آفتاب و بزانو جواب کرد

(یعنی اس کے حسن نے آسمان سے جواب مانگا۔ آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے)

سر از روئے تو گردم گر ہست باز کشائی — کہ کمان نہ بانداز ابروی کسی است

ہر چند کہ زلف تو سیاہی است جاں — زیں گونہ پریشاں نتواں کرد سپہ را

رسانہ حصہ بدرم می کیار آمد گفت — چہ حصہ کہ رسد آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے۔

ع۔ درد باوادی و درمانی ہنوز۔

ع۔ یار با ماو آنکہ ہمہ عمر بہ کردی بازم۔

امیر صاحب نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر زور صرف کیا کہ ہم کو ڈر تھا کہ جو حال انہوں نے بتایا اس میں خود نہ پھنس جائیں۔ لیکن بہ حسن اتفاق سے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں۔ مثلاً فرخی در المعجم وغیرہ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے۔

امیر صاحب اوروں کی نسبت کسی قدر آلودہ ہیں۔ تاہم ان کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچے کہ نکتہ گری کی زد میں آجائیں صنعت طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں۔ ع

درد باوادی و درمانی ہنوز

زندہ و جاں آزاد گردم — اگر تو ہم نفس بندہ باشی

من زلطف را کشتی بغمزہ — کرم کردی آں بسی زندہ باشی

گفتم با خوش چراغی خسرو — چوں کنم آں شکل ز آں بالا ترین است

بندہ را در غم تو مست خبر — ہمہ یاراں بندہ را خبر است

خرد سالے بمن کند بیداد — اے بزرگاں شہر داد دہید

عربیت

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر صاحب کو عربی علم ادب میں کمال تھا اور اس فن کی نادر کتابیں ان کے حافظہ میں محفوظ تھیں۔ تاہم ان کو اس فن میں دعویٰ نہیں تھا۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود امیر ان کو

---

[1] عالمًا [2] دھوپ میں پھری ہے۔ [3] چراغ کردن۔ چراغ جلانا۔

گے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت تھی۔ اشعار یہ ہیں۔

ذاب الفؤاد و سال من عینی الدم　　وعلی الدموع کل ما اما اکتم

دل پگھل گیا اور آنکھوں سے خون بہا　　اور آنسوؤں نے وہ سب کہہ دیا جو میں چھپاتا تھا

واذا اعب لدی الوری کرب الہوی　　شکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے ہجر کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے۔

ما عادل العشاق وعنی باکیا　　ان السکوت علی المحب محرم

او ناصح اور مجھے رونے دے　　چپ رہنا عاشق پر حرام ہے

من بات مثلی فھو یدر حلیلتی　　طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے

اخبار حسرودی میں عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں جن سے اُن کی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ان میں مادہ سدی اور لغو تکلفات ہیں لیکن نہ اس زمانہ کا عام انداز تھا یہاں پر الزام نہیں آسکتا۔

وان اما الا من غزیۃ ان غوت　　غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہرحال صدقریہ کا آدمی ہوں۔ قریہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہے تو میں بھی ہوں۔

صنائع و بدائع

امیر صاحب نے صنائع و بدائع میں جو زور آزمائیاں صرف کیں اگرچہ کوہ کندن و کاہ برآوردن ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ ان کی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے۔ ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے۔

ان میں سب سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اس لئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً صنعت سقوط یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو۔ امیر صاحب نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں بعض فارسی میں تھیں لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ نہیں لکھی جا سکتی تھی۔ امیر صاحب نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں انھوں نے تصرفات کئے۔ اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں۔ چنانچہ ہم انھی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں۔

ذولسانین

یعنی ایسی عبارت لکھی کہ لفظوں کے رد و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور بامعنی ہو۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی۔ بدیدی۔ مرادی سمائی　　زبانے ساشی۔ بیاری نشاتی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ کل تو آیا اور تونے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا ایک ذرا ٹھہرا تو دوستی کرنے کے قابل ہے۔ لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں۔

رشیدی بدیدی بمرادی سعادی　　زمانی سائیں بتادی بسائی

تو میرا ابلاس پانا ہے۔ بے شک میری مراد ہے میری نجات ہے۔ مجھ کو اس بات نے ناامید کیا کہ عورتیں باہم لڑتی ہیں۔

قلب اللسانین

چند اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے مثلاً

بسی با کامرانی در جہاں باش
می باش نکار ساد ابی۔
بای یار با کہ کاری کیمیا بہم۔
دوست یاری۔ نہ باری باآتی۔
نکی داد و بخت و کامران باش۔

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے۔

وصل الحرفین

یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آنے۔ بلکہ دو دو۔ یا تین تین حرف کا لفظ ہو مثلاً

چاکر۔ جامہ۔ حاجی ترتالی۔ سر مدست۔ بربا است می بالد دمی گوید کہ
بدیں جامہ حاضر با ارجمت دریں می باشد باید کہ گہہ گہہ جامہ ناسہ در باہم
تا بر خوشی کہ بر است فرحی کامل باید۔

یہ اس صنعت کا نقیض ہے جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً

در۔ دور۔ دواو۔ آورد۔ زرداد۔ داری۔ درازی۔ دگار۔ دا ۔۔
وادر دوران را الخ

امیر صاحب نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

اربعۃ الحرف

اس صنعت پر امیر صاحب کو بہت ناز ہے کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف۔ ہ۔ واؤ۔ ے کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے۔ یعنی تمام الفاظ صرف انھی حرفوں سے بنے ہیں لیکن جو عبارت لکھی ہے۔ وہ بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنہ والشفا

اس صنعت پر بھی ان کو ناز ہے۔ اس میں ایسے الفاظ جمع کئے ہیں کہ سطروں کی سطریں پڑھتے جاؤ لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی۔ صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمۃ اللفظ

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیے

ڈاکٹر تارا چند

امیر خسرو اور ہندوستان

کسی ملک میں کسی زمانہ میں ایسا ... ہے کہ سب لوگ ایک مذہب رکھتے ہوں، ایک نسل سے ہوں، ایک زبان بولتے ہوں، سب کی رسمیں ایک ہوں اور ان کے خیالات میں کوئی فرق نہ ہو۔ ہر ایک ملک کی آبادی بھانت بھانت کی ملتوں اور قسم قسم کے گروہوں سے مل کر بنی ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس کے بارہ میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں تنوع نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ قومیت کا تقاضا ہے کہ نسل، مذہب، تمدن، زبان کی کثرت میں سیاسی وحدت کا جذبہ جاری اور ساری ہو۔

آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم ہندی تنوع کو ساخت کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو بنیادی مان کر ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کے فرق قومیت کے راستے میں حائل ہوں۔ اسی شک و شبہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ خصوصاً پچھلے زمانہ کی تاریخ کو علم کی شفاف روشنی میں نہیں بلکہ بدلیوں کے گرد و غبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں۔ چونکہ قومی احساس کے بننے بگڑنے میں تاریخ کا گہرا اثر ہوتا ہے تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہیے غور نہیں کیا۔ تاریخ قوم کی لمبی اور سچی سرگذشت کی یاد ہے اور جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد ہے جو اس کے ذہن میں محفوظ ہیں اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ جداگانہ سلسلہ ہے جس سے قوم اپنی نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتی ہے۔ تاریخ دانوں کی غلطیت اور بے راہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے۔ اپنی روایتوں کی غلط تعبیر سماج کے بندھنوں کو ڈھیلا کر سکتی ہے اس میں شک نہیں اس معاملہ میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے جو ڈگر چلائی اس کے نتیجے ہمارے لئے بدبختی کا باعث ہوتے اور اگر اسے ابھی ہم نہ چھوڑیں تو آئندہ کے لئے سخت نقصان پہونچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ امیر خسرو کی شاعری کے جام سے ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ اپنے اصلی رنگ میں ملک کے سامنے آئے اور غلط فہمیوں کے دروازے بند ہوں۔ امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرہویں اور چودہویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملواں جلی تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور زاہد اس زمانہ میں کیسے جذبے کیسے خیال رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے

وطن کو تمام دنیا کے ملکوں بلکہ جن میں اسلامی ملک شامل تھے ترجیح دیتا تھا اس کے دل اور دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی فضا کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قومیت کا وہ جذبہ جو آج نظر آتا ہے اس زمانہ میں موجود تھا۔ آج سے چھ سو سال پہلے سماجی یا فردی زندگی میں اس کی تلاش الٹی گنگا بہانی ہے۔ پچھلے زمانہ میں سماجوں کا نظام آج سے مختلف تھا، رشتہ بندی کے اصول جدا تھے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت نسب کو دی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی کسی خاص قبیلہ یا ذات سے وابستہ ہوتا تھا اور قبیلہ یا ذات کے لوگوں کا رشتہ کسی حقیقی یا خیالی مورث اعلیٰ سے جا ملتا تھا، سب فرد اپنے آپ کو اس کی اولاد سمجھتے تھے۔ اس طرح اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان قبیلوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے ہندوؤں کے سیکڑوں قبیلے اور ذاتیں تھیں اور یہی مسلمانوں کی حالت تھی۔ سیاست کا دارومدار بھی اسی اصول پر تھا، نہ کل ہندوستان کی کوئی ایک ہندو جماعت تھی نہ کوئی ایک اسلامی۔ ہندوستان کے کچھ شمالی حصوں پر جو خاندان حکومت کرتے تھے وہ توران اور خراسان سے آئے تھے ان کا مذہب اسلام تھا مگر ان کی سیاست کی بنیادیں اسلامی نہیں کہی جا سکتیں ان کے کاموں میں اسلامی وحدت کا جذبہ کارفرما نہ تھا ان کی سیاست خاندانی اور عنا صری معاد پر مبنی تھی اور یہی صورت ہندو راجوں مہاراجوں کی تھی۔ یہ بھی غلط عقیدہ ہے کہ جو فاتح باہر سے آئے وہ مذہب اسلام پھیلانے کی غرض سے ہندوستان پر حملہ آور ہوتے اور یہ بھی کہ جن ہندو راجوں نے ان کا مقابلہ کیا وہ ہندو مذہب کی رکھشا کے لئے لڑے۔ دونوں طرف لڑائی زر، زمین اور زن کے واسطے تھی، دونوں طرف مذہب کی دہائی دینے والے وہ مولوی اور پنڈت تھے جنھیں تلوار اٹھانے سے سروکار نہ تھا۔ تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا اس کے لئے غرض کی کون سی حجت تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ سندھ میں بدھ مذہب کا خاندان راج کرتا تھا۔ برہمن وزیر نے اس کے خلاف سازش کی اور تخت سے اتار دیا۔ عربوں کو خانہ جنگی کی خبر ملی کچھ شکایتیں لے کر لوگ حجاج تک پہونچے، اسے موقع ہاتھ آیا۔ سمندری ڈاکوؤں کا بہانہ ملا گیا۔ داہر سے معاوضہ طلب کیا گیا۔ اور اس کے انکار پر دھاوا بول دیا گیا۔ رعایا نے جو راجوں کے ظلم سے ملتی تھی حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ سندھ کے شہر اور قلعے محمد بن قاسم کے ہاتھ آئے۔ دونوں میں سے ایک کے سامنے بھی کوئی مذہبی مقصد معلوم ہوتا ہے اور نہ

اخلاقی ۔

محمود غزنوی کے عملوں کو مذہب کے گہرے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے مگر تاریخ تلاش ہے کہ تعصب کیا ہے ۔ سامانی خاندان کے امیر سبکتگین کے دل میں اپنے آقا کے خلاف آگ بھڑکتی ہے، سبکتگین کا لڑکا محمود جو ایک جری سپاہی اور ناموَر سپہ سالار تھا سامانیوں کو خراسان سے نکال کر سلطنت کا مالک بن جاتا ہے ۔ اس کے سامنے آل بویہ اور خلیفہ بغداد کا جھگڑا آتا ہے آل بویہ مذہباً شیعہ تھے خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے ۔ خلافت تو خود ہی دم توڑ رہی تھی ۔ اس نے اپنی عمر کے کچھ سال بڑھانے کے لئے محمود کا سہارا ڈھونڈا، محمود کو ایران پر تسلط حاصل کرنے کا موقع ملا مسلم اور غیر مسلم فوج لے کر شمالی ایران کو روندنا شروع کر دیا، ایلخانیوں اور دیلمیوں سے جنگ چھڑ گئی ۔ ادھر مشرق کی سرحد پر ہندوستانی راجے جنہیں سبکتگین نے افغانستان سے باہر کر رکھا اس تاک میں تھے کہ کھوئے ہوئے ملک کو پھر لے لیں ۔ محمود نے دو طرفی لشکر کشی شروع کر دی ایک مرتبہ ہندوستان پر حملہ کرتا تھا اور دوسری بار وسط ایشیا یا ایران پر ۔ مسلمان ریاستوں نے اس کا مقابلہ کیا نہ ہندو راجوں نے ۔

ادھر اس نے اسلامی علاقوں پر قبضہ کیا ادھر مندروں کو گرایا اور مال و دولت کو لوٹا، نہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کی نہ ہندوؤں کو چھوڑا ۔ درباری شاعروں نے تعریف کے پل باندھ دیئے خلیفہ نے یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابوں سے نوازا کوئی نہ پوچھے جس شخص نے ایران کے مسلمان حاکم خاندانوں کو تباہ کر دیا اور خلافت کو اسی منصب پر چھوڑ رکھا جس کا وہ تھا جو اکبر جنگجو اور بلا کو غیر مسلم سرداروں نے اسلامی مملکتوں اور عباسی خلافت کو خاک میں ملا دیا اسے کس طرح اسلامی دولت کا بانی اور اسلامی ملت کا محسن سمجھا جائے ۔ پھر محمود کے بت شکنی کے دوران میں ہندو سماج اور ہندو ریاست کا کہاں نشان تھا ۔ محمود آتا ہے متھرا کو، نگرکوٹ کو، قنوج کو، سومنات کو تہ و بالا کر دیتا ہے، کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کس ہندو شخص نے ان پوتر استھانوں کی حفاظت کے لئے کوشش کی غزنی سے پانچ اور غزنی سے کالنجر تک دھاوے ہوئے ہیں سوائے مقامی راجوں کے کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ۔ کیسا تعجب ہے ان ہم وحشیانہ خونریزیوں کو ہندو دھرم اور اسلام سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ پھر اس کا کیا جواب ہے کیوں محمود نے اپنی فوج میں ہزاروں ہندو سپاہی بھرتی کر رکھے تھے کس طرح محمود نے ہندو سرداروں سندر، تلک، سیوند رائے پر اعتماد کیا ۔ احمد نیالتگین ہندوستان کا حاکم مقرر ہوتا ہے بغاوت کا جھنڈا اٹھاتا ہے محمود تلک کو اس کی سرکوبی کے لئے ہندوستان بھیجتا ہے تلک اور ہندو جاٹ مل کر نیالتگین کا قلع قمع کر دیتے ہیں ۔ کرمان میں جنگ ہوتی ہے محمود کی فوج کا سپہ سالار وہی تلک دو ہزار ہندو اور ایک ہزار ترک اور ایک ہزار کرد اور عرب سپاہیوں کو لے کر لڑنے جاتا ہے دشمنوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر فوج تتر بتر ہو جاتی ہے ہندوستانی افسر بھاگ کر غزنی پہونچتے ہیں محمود انہیں برخاست کرتا ہے چھ ہندو افسر اتنے شرمندہ ہوتے ہیں کہ خنجر بھونک لیتے ہیں اور جان قربان کر دیتے ہیں ۔ وسط ایشیا میں مرو کے مقام پر محمود کے ہندو سپاہی لڑتے نظر آتے ہیں ۔ تاتورکان میں ہندو فوجی دستوں کی نگہبانی کرتے ہیں، خوارزمیوں اور محمود کے جنگی ہاتھیوں کی فیلبانی کرتے ہیں ۔ ملع کے نزدیک ہندو فوج کا کیمپ ہے، دراصل تلک کا نام کا فردوں کا حصہ رہے ۔ ان واقعات کی کیا تشریح ہے؟ بت شکن بادشاہ اور بت پرست سپاہیوں کا کیا رشتہ تھا؟ ہندو واقعہ کیوں مسلمان امیر کے لئے جان دیتے تھے، مسلمان امیر کیوں ہندوؤں پر بھروسہ کرتا تھا ۔ ۹

محمود کی اولاد قریب ایک سو پچاس برس تک پنجاب پر حکومت کرتی ہے اس عرصہ میں ہندوستان میں کہیں ہلچل نہیں ہوتی ہندو سماج میں کوئی ایسی تحریک نہیں نکلتی جو مذہب کے نام پر راجاؤں کو جمع کرے اور دشمنوں سے لوہا لے، غزنویوں سے اگر کوئی پنجاب کو خالی کراتا ہے تو وہ غوریوں کا خاندان ہے ۔ انہیں کے معرکوں سے ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، پہلے شمالی ہندوستان اور پھر دکن میں ترکوں کی حکومت قائم ہوتی ہے ایک کے بعد دوسرا خاندان تاج و تخت کا مالک بنتا ہے لیکن کسی بھی خاندان کی سلطنت سو برس سے زیادہ نہیں چلتی

التمش، بلبن، علاؤالدین خلجی، محمد بن تغلق نے بڑے دبدبے کے ساتھ حکومت کی ۔ لیکن ان کی کامیابی ان کی ذات تک محدود رہی ان کے مرنے کے ساتھ طوائف الملوکی پھیلی ۔ نہ کوئی ایسی ملت قائم ہوئی جو ان میں سے کسی خاندان کی پشت و پناہ ہوتی اور نہ کوئی ایسا سماجی طبقہ تھا جو انہیں سنبھالے رکھتا اگر ہندوؤں نے ان سے طاقت چھیننے کی کوشش نہیں کی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے قبیلوں اور خاندانوں میں کوئی اتحاد نہیں تھا، مذہبی اور سماجی زندگی کو سیاست کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں تھا، اسلامی ملت اور ہندو سماج کے تصور حقیقت سے کوسوں دور تھے ۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے مذہبی جنگ و جدل ایک فسانہ ہے جسے انیسویں صدی کے فرنگی تاریخ دانوں نے گھڑا ۔ ممکن ہے اسے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح سمجھتے ہوں ممکن ہے انہیں سچ مچ ملیں ہو کہ واقعات کی نوعیت یہی ہے، لیکن کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تاریخ کے ان گلے سڑے علاقوں کو اتارا جائے اور ان فرضی نظریوں کی سچی کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے، تاریخ کو مذہب نہیں علم کی روشنی میں پڑھا جائے ۔

اس زمانہ کے ہندوستان میں دو مذہب اہمیت رکھتے تھے دونوں مذہب انتہائی لطیف اور پاکیزہ خاصیتوں کے حامل تھے، دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ قدروں کے پشت و پناہ تھے ۔ ان کے وسیلہ سے انسان حقیقت میں انسان بنتا ہے اپنی سفلی جبلتوں اور حیوانی خواہشوں پر غلبہ پاتا ہے لالچ ۔ غصہ، حسد، شہوت، بے رحمی اور تنگ نظری کی غلاظتوں سے دل کو صاف اور دماغ کی کدورتوں کو دور کرتا ہے دونوں وجدان اور نفس میں ہم آہنگی پیدا کرتے اور انصاف اور حق، انسانی محبت اور خلق کی خدمت کی دعوت دیتے ہیں ۔ کس طرح ان مذہبوں کو قتل و غارت دشمنی اور آزار کا جواز بنا لیا جائے ۔ بات یہ ہے جنگ اور جدل کی وحشیانہ حرکت کے لئے ہر زمانہ میں لوگ عذر ڈھونڈتے رہتے ہیں اپنے بیہا ۔ اعمال کو مذہب کے سر تھوپتے ہیں صدیوں تک یورپ کی دونوں لڑائیوں میں دونوں طرف کے عیسائی پادری اپنی قوم کو حق بجانب اور دوسری کو شیطان کے

پہلے میں مولانا سے مجھ خدا اور پیغمبر سے دعا مانگتے تھے کہ مذہب کے دشمنوں کو شکست نصیب ہو۔ ایسی ہی کچھ کیفیت ہندوستان کے حملے زمانہ کی تھی۔ سچ پوچھئے تو مذہب اور دھرم کی ٹٹی کے پیچھے ملک اور دولت کے لالچی شکار کھیلتے تھے ملت اور سماج کا تصور شاید اس وقت کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ تاریخ دانوں کی غلطی ہے یا ہٹ دھرمی اور غیر تاریخی کوشش ہے جو اس زمانہ کے کارناموں میں آج کل کے محرکات کو کارفرما سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ تاریخ کی تصویر کے دو رخ ہیں ایک طرف امن اور شانتی کا نقشہ ہے جس میں انسانیت کے ارتقا، ہمدردی اور غمگساری کی وسیع اور مادی پریم کے پھیلاؤ کی جھانکی ہے، دوسرا رخ لال خون سے رنگا ہوا ہے۔ اس رخ میں انسانی خون کے پیاسے جاہ و دولت کے لالچی اور زبردستی کے دیوانے گھمنڈ کے گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذہب کا پہلے رخ سے واسطہ ہے اسے تاریخ کے دوسرے رخ سے وابستہ کرنا مذہب کی توہین ہے انسانیت اور اخلاق کو منہ چڑھانا ہے۔

مجھے اس لمبی تمہید کی ضرورت اس لئے معلوم ہوئی کہ امیر خسرو کے حالات کو سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ جس زمانہ میں امیر خسرو نے زندگی بسر کی اس زمانے کے ذہنی ماحول کا اثر ان پر ناگزیر تھا۔ ان کے قلم سے کبھی کبھی ایسے نعرے نکل جاتے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ اسلام کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں اور دوسرے مذہبوں پر اس کی برتری کے قائل ہیں بھی ایسے لفظ بھی استعمال کرتے ہیں جو رواداری کی روایتوں کو ٹھیس لگاتے ہیں۔ باوجود اس کے گہری نظر سے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کس قدر ان کا دل اور دماغ ہندوستانیت سے لبریز تھا۔

اصل یہ ہے کہ خسرو کی ذات قرآن السعدین تھی جس میں دو تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ ان کے والد لاچین قبیلہ کے ترک تھے ماں نسل سے ہندوستانی اور عماد الملک راوت عرض کی بیٹی تھی۔ خسرو اپنے بارہ میں خود لکھتے ہیں "زنسل عارض آسود مہم" یعنی نانا رنگ کے سانولے تھے۔ باپ بے پڑھے تھے لیکن امیر آدمی تھے پیشہ سپاہی کا تھا۔ مگر خسرو آٹھ برس کے ہوئے تو سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا بوڑھے نانا کی سرپرستی میں دہلی میں تعلیم ہوئی مہربان نانا کی لاڈلی گود میں پلے اور بڑے ہوتے ہیں مکتبوں اور استادوں کی ساکری سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ خسرو طبعاً ذہین تھے، قدرت نے نہایت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، شاعری کو طبیعت سے فطری مناسبت تھی، ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے تھے کہ شعر کہنا شروع کردیا۔ کہتے ہیں "ہنوز دندان میافتاد کہ سخن می گفتم"۔ خواجہ عزیز الدین سے جو بڑے عالم تھے خسرو تخلص کا لقب ملا، انیسویں سال میں اپنے بچپن کے کلام کا دیوان "تحفۃ الصغر" تیار کردیا۔ امیر خاندان کے تھے شروع ہی سے امیروں کے درباروں سے تعلق ہوگیا۔ خسرو نے اپنی بہتر برس کی عمر میں سات سلطانوں کا زمانہ دیکھا۔ اکثر نے ان پر عنایت کی اپنے خاص ندیموں میں جگہ دی عزت اور اکرام کی نگاہ سے پرورش کی۔ کچھ حاسدوں کو پسند نہ آیا لیکن ان کی دشمنی سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خسرو کو ابتدائی جوانی میں محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی خدمت کا فیضان حاصل ہوا۔ ان کی صحبت میں دنیا کے علائق سے تیاگ قناعت کی برکت سے بے نیازی سیکھی۔ اقرار کرتے ہیں۔

ہست ان دارم اندر پیس نہ دار
کز در ہر میر نتوم بے سار

اس کے بعد سے خاص طور پر میری یہ نیت ہوگئی ہے کہ میں شاہی دربار سے بے نیاز ہو جاؤں۔

بیتنے نہ خورم نہ شاہی نرکس
چون بہ خدا و بدکنم روی وکس

قرآن السعدین

نہ مجھے کسی کی پشت پناہی کی ضرورت ہے نہ امان کی میں نے تو اپنے آقا و مالک کی طرف اپنا دھیان کر لیا ہے۔

استغنا کا یہ عالم تھا ؎

من کہ نہادم زبحر گنج پاک
گنج زر اندر نظرم ہست خاک

قرآن السعدین

میں نے شاعری کی دولت اور خزانہ جمع کیا ہے زر کا خزانہ میری نظر میں ہیچ ہے۔

ان کے کردار رفعت کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

دست طمع پیش کسان چوں مکن دراز
پل بستہ ای بگذری از آبروئے خویش

اگر حرص اور لالچ کا ہاتھ تو نے کسی کے سامنے پھیلایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تو نے پل باندھ لیا ہے جس پر ہوکر تو اپنی عزت و آبرو سے گذر جاتا ہے یعنی اپنی عزت کھو بیٹھتا ہے۔

خسرو صوفی منش دردمند انسان تھے ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت بھی شاعری بھی [illegible] ہے۔ شاعروں میں ان کا پایہ اونچا ہے ہندوستان میں کوئی ان کا مثل پیدا نہیں ہوا، زندگی میں خراسان اور ایران سے خراج تحسین حاصل کیا اور آج بھی ایران میں چوٹی کے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔

شاعر کے بارہ میں کہا جاتا ہے اپنے زمانہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ خسرو اس قول کے بہترین نمونوں میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں تیرہویں اور چودہویں صدی کے ہندوستان کی دلچسپ کا بڑا سنہرا عکس دکھائی دیتا ہے، سماج کی زندہ تصویریں ہیں، اخلاقی مدرسہ کا کامل نقشہ ہے زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں، شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے ہیں۔ راہ عشق کے پیچ و خم محبت کے متوالوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے، اور ناکاموں کا المیہ۔ پند و نصیحت، حکمت و تدبر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے جو خسرو سخن کی قلمرو کے باہر ہے۔

کلام کا حجم اتنا ہے کہ ایک مقالہ میں اس کا احاطہ غیر ممکن ہے۔ میں آج اس کے صرف چند پہلوؤں کی طرف آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ میرے مضمون کا عنوان ہے "خسرو اور ہندوستان" پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان دنیا کے تمام ملکوں سے بہتر اور برتر ہے۔ کہتے ہیں "کشور ہند است بہشتی بزمین" اور اس کے ثبوت میں ایک نہیں سات حجتیں پیش کرتے ہیں۔ حجتوں کو جانے دیجئے۔ ان کے پیچھے جو جذبہ ہے دیکھئے کہتے ہیں اس وجہ سے ہند کو ترجیح دیتا ہوں۔

گفت کسی کس زمیں از دور زمن
ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن

...میں سے ایک یہ ہے کہ آغاز زمانہ سے یہ ملک میرے ساتھیوں کی جگہ اور میرے دوستوں کا مقام اور وطن ہے ۔

دیں رسول آمدہ کاین زمرہ دیں
حب وطن ہست ز ایمان بہ یقیں

اور یہ رسول کی حدیث ہے کہ اپنے دین والوں اور وطن سے الفت رکھنا ایمان کا تقاضہ ہے ۔

پھر دوسری دلیل اس بات کی دیتے ہیں کہ کیوں ہند کو روم، عراق، خراسان اور قندھار پر فوقیت حاصل ہے کئی دلیلیں اس بات کی دی ہیں کہ ہندوستان کی ہوا خراسان سے بہتر ہے

نی چو خراسان کہ بی از برف نزوں
سرد بیمار بسے بود سقط درون

وہ خراسان کی طرح نہیں ہے جہاں ہم سردی کی زیادتی کی وجہ سے ٹھنڈا اور اندر بیمار کی طرح ہو ۔ دس جوڑوں والا ہو جاتا ہے ۔

پھر کہا ہے ۔

چار مستان کیں طرف از سبزہ و گل
ہست ہمہ سال بہار و گل و مل

چوتھی دلیل ہندوستان کی خوبی کی یہ ہے کہ اس کے گرد چاروں طرف سبزہ اور پھولوں کی فراوانی کی وجہ سے پورے سال بہار اور کھلے ہوئے پھولوں اور شراب کا منظر دکھائی دیتا ہے ۔

اور ہندوستان کے خوشبودار پھولوں، قسم قسم کے میووں، پنے گٹھلی کیلے اور پان کی تعریف میں شعر کہتے ہیں۔ پان کا ذکر یوں کرتے ہیں ۔

ہست دگر آں کہ چو تنبول گزیں
میوہ ساشد نہ ہمہ روی زمیں

دوسرے یہ کہ پان جیسا منتخب میوہ ساری دنیا میں نہیں ملتا ۔

آم اور انجیر کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کو جو انجیر کے سامنے آم کی قدر کرتے ہیں لاف زن کا لقب دیتے ہیں پھولوں پر اس قدر فریفتہ ہیں کہ ایک ایک کا نام لے کر تعریف کرتے ہیں گل کوزہ، صد برگ، بیل، جوہی، کیوڑا، رائے چنپا، مولسری، دونہ، کرنا، سیوتی سب کا نام لے کر کے بعد خراسانی پھولوں سے برتری کا سبب بتاتے ہیں ۔

چو سمن ارغوان و لالہ حسداں
کہ رنگی ہست بوئے نیست چنداں

اگر ارغوانی لالہ کو ہنستا ہوا دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے رنگ تو خوب ہیں لیکن خوشبو نام کو بھی نہیں ۔

گل ما را نہ ہندی نام زشت است
وگر نہ ہر گلی باغ بہشت است

ہمارے پھولوں کے نام ہندی ہونے کی وجہ سے خراب ہیں ورنہ حقیقت میں ہمارے باغ کا ہر پھول باغ جنت کی طرح ہے ۔

گر این گل ہا سے در روم و شام
کرودے پارسی یا تازیش نام

اگر یہ پھول روم اور شام میں اگتا تو اس کو فارسی یا عربی نام ملتا

شدے معلوم نامرغان ان بوم
جہان مشغول زد ملے درارے و روم

اور جب اس سرزمین کے پرندے کو پتہ چلتا تو وہ شام اور روم کے شہروں میں اس طرح غلغلہ مچاتے ۔

کہ اینہا گل چنیں باشد کہ سالے
دہد بو در دور ماندہ از نہالے

کہ یہ پھول اس سال اس طرح کا ہو گیا ہے کہ درخت سے دور دور تک خوشبو پھیلاتا ہے ۔

کپڑوں کی تعریف میں فرماتے ہیں ۔

نکو داسد خوباں پری کیش
کہ لطف دلوگری ارکتان بیش

پریوں جیسی صورت رکھنے والے حسین اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوگیری کا کپڑا بہت باریک ہوتا ہے ۔

ز لطف آں جامہ گوئی آفتابیست
ز یا خود سایہ یا ماہتابیست

لطافت میں جو کپڑا آفتاب کی طرح معلوم ہوتا ہے اور نہ کہیے کہ وہ خود ہی سایہ ہے یا چاندنی ہے ورنگل سے جو تحفے آتے ہیں ان میں ایک قسم کا کپڑا ہے

مہیں جامہ ابریشمیں ہندوانہ
کہ یک گز شود دہ کس از دوانہ

ہندوستان کے ریشم کا بنا ہوا کپڑا اتنا مہین اور باریک ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر تو وہ ایک گز معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے دس حصے ایسا دہ کئے جا سکتے ہیں ۔

زبس لطف وہ گز بدیدہ گنجد
کہ دیدہ زگنجیدن ان نرنجد

اس کا دس گز کپڑا آنکھوں میں سما سکتا ہے اور اس کے سما جانے سے آنکھوں کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی ۔

نہ زو بگذرد نم نہ آید زچربی
نہ چون قطرۂ آب یکاں حسر بی

نہ اس میں سے پانی نکل سکتا ہے اور نہ کسی طرح کی چکنائی گزر سکتی ہے اور نہ حسن تیر اس طرح پار ہو سکتا ہے جس طرح پانی کا قطرہ نہیں نکل سکتا ۔

اور ایک کپڑے کے بارے میں کہتے ہیں ۔

جامہ ہندی کہ ناسد نام
از تنگی تن ہمایہ بہ شام

ہندوستان کا ایک کپڑا ہے جس کا نام لوگ نہیں جانتے وہ اتنا باریک
ہوتا ہے کہ اگر اسے کوئی پہنے تو سارا جسم نظر آتا ہے۔

مانند حباب ساحل بحر ان
نازک تا نش بو سد حباں

اگر اس کو ہاتھ میں بھی پست لیا جاتے تو پوشیدہ ہی رہے حالانکہ
اگر اس کو کھولیں تو ساری دنیا ڈھانپ لے۔
(یہ ملاکہ کا "آب رواں" تو نہیں جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ پورا تھان ایک انگوٹھی
کے حلقہ میں سے نکل جاتا تھا۔)
ہندوستان کے پرندوں کا بیان سن لیجئے۔ طوطے کے بارہ میں کہتے ہیں جانور
نہیں آدمی ہے۔

فاتحہ و اخلاص و دعا ور دہنش
یا من و تو ہم چو من و تو سخنش

اس کی زبان پر سورۂ فاتحہ اخلاص اور دعاؤں کا ورد رہتا ہے اور
ہمارے تمہارے ساتھ تمہاری ہماری طرح باتیں کرتا ہے۔
پھر شارک کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ سیاہ پرندہ ہے عجم میں ہے نہ عرب میں۔ کوے کی کائیں
کائیں میں بھی خاص اثر ہے اس کی بولیوں سے شگون لیتے ہیں اور جو نیا لوبہان راز
آکھبر دی ہے۔ لیکن مور کے لئے تو ہمیں کے زبا بہادئے ہیں پوچھتے ہیں۔

گر نہ بہشت است چرا ہست چرا
از پئے طاؤس جہان گشت مرا

اگر ہندوستان بہشت نہیں ہے تو پھر مور کی وجہ سے میرے لئے
جنت بن گیا ہے۔
ہمیں اسے طائر قدسی کہا ہے کہیں سانا ہے کہ ہد ہد جو مرغ سلیمان ہے اس کے زبان
کو دیکھ کر انگلی کاٹتا ہے اور آخر میں مصداق دے ۔ تا ہے۔

ہمہ واسد کہ ہیدا نہ رہ نہان
نیست جنس مرغ زر اطراف جہان

پوشیدہ اور ظاہر طور پر سب جانتے ہیں کہ اطراف عالم میں اس طرح
کا پرندہ کوئی نہیں۔
ہاتھی مرن کی چال، گینڈے کے زیر و بم، گھوڑے کے ناچ، بندر کی نقل،
بکرے کا لکڑی پر چلنا، ... طرف سے رکھ کر کھڑا اور ہاتھی کا آدمیوں کے سے کام کرنا
سب ... لے نے کر ساتے ہیں۔ لیکن ہندی حسینوں کو دیکھ کر تو بے تاب ہو جاتے
ہیں سو ملک چین بھی ہندوستان کے ایک مال کے برابر نہیں، ... کے جو پریاں
کی آنکھیں ... ہیں لیکن چہروں پر بے رونقی ہوتی ہے، خراسانی سرخ و سفید ہیں لیکن
خراسانی پھولوں کی طرح بے بو ہیں، روم اور روس ... کا حال
مت پوچھئے۔

سپید و سرو دہم چون کند ...
... ستان دم جو رد حالون دو رخ

برف کی سی کی طرح سفید اور ٹھنڈے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر دوزخی
عورتوں کی سانس کھولتی جاتے۔
ستاروں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور حبشی والیوں میں ملاحت نہیں، سمرقندی اور
قندھاریوں میں بشریت کی کمی ہے تو مصریوں میں چستی اور رعنائی عرض کہیں بھی وہ جو ہر خوبی
اور دلربائی نہیں جو ہند کی حسیناؤں میں ہے۔
ہندوستان میں جو شہر سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہی آپ کا شہر
دہلی ہے کہتے ہیں۔

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است کہ آباد باد

دہلی کے دین اور انصاف کی شہرت اطراف میں پھیلی ہوئی ہے یہ عدن
کی جنت ہے خدا اس کو آباد رکھے۔

ہست چون ذات ارم اندر صفات
حرسہا اللہ عن الحادثات

یہ اپنی صفات اور خصوصیات کی بنا پر باغ ارم کی طرح ہے خدا اس کو
زمانے کے حوادث سے محفوظ رکھے۔
پھر اس کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے تاب کو ملک تاسہ کا نمونہ بتاتے ہیں
جامع مسجد کو کعبہ سے ملا دیتے ہیں، قطب مینار کو آسمان تک ہو جانے والی سیڑھی اور
آسمان کو سنبھالنے والے ستون سے، حوض خاص کے پانی کو لو رسے جس میں آسمان
کا عکس نظر آتا ہے جس کی زمین ریت کے دانوں کو اندھا آدمی رات کی اندھیرا
میں گن سکتا ہے۔ دہلی بلند مرتبہ تاجداروں کا پایۂ تخت ہے جہاں ملک کے برگ
اور مملکت کے رکن رہتے ہیں۔ اس کے باشندے فرشتہ سیرت اہل جنت کی
مانند خوش دل اور خوش خو ہیں۔ صنعت میں علم اور ادب میں گانے بجانے اور کرتبوں
میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں۔
ہندوستان کے موسموں کا بیان کس آب و تاب کے ساتھ کرتے ہیں؟ جاڑا آتا ہے
تو ہندوستان جنت نشان بن جاتا ہے گھر اور باہر ... اندر مرغزار بن
جاتے ہیں۔ سارا میں پھول پھیلتے میں بلبلیں گاتی ہیں، عاشق اور معشوق گھروں سے
باہر سیر کو نکل آتے ہیں دریا و ... گرمی تو اس ملک کا خاصہ ہے لیکن
یہ اس لئے ہے کہ

مہر ملک گرم ستر اندر وفاش
گرم ازاں گشتہ جہاں را ہواش

اس سے دیار ارس کے عشق میں آسمانی سورج گرم ہو گیا ہے یعنی اس
میں گرمی ہندوستان سے عشق کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور
پھر اس سے سارے عالم کی ہوا گرم ہوتی ہے۔
برسات کا موسم آیا تو آسمان پر بادلوں کا شامیانہ چھا گیا، جنگل میں ہر طرف سبزہ کی

فصلیں تیار ہو گئیں، دھان کے پودوں کے سر پانی میں ڈوب گئے، باغوں میں پھلوں کے درخت میووں سے لد گئے، نالے اور ندی چڑھ گئے، جھیلیں اچھلتی ہوئی گھومنے لگیں۔ پھر جاڑوں کی فصل نے ہوا کے گھوڑوں کو گلستانوں کی بربادی کے لئے چھوڑ دیا۔ پتیاں سوکھ کر پیلی پڑ گئیں، مصیبت نے ملا ماس نہیں لیا۔ سوسن، صد برگ، سیوتی کے مجموعوں کی پیالیاں گر گئیں اور درخت ننگے ہو گئے، ملیں کٹ گئیں اور طوطے گونگے ہو گئے۔

اپنے دیس کے چرند، پرندوں، ہوا، پانی، گل، دانہ، جنگل، دریا، جھرنوں کے رنگ و روپ سے خسرو اس قدر متاثر تھے کہ بار بار ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے گن گانے سے تھکتے نہیں لیکن یہ تو پھر بھی سطحی چیزیں ہیں اور شاعروں کا کبھی دھیان اس طرف گیا ہے جواب کم ملتی ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتی ہے جس طرح سے خسرو نے ان پر گہری نظر ڈالی ہے اور ایک بے لاگ مگر ہمدردی سے بھری ہوئی تنقید کی ہے اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔

زبان کا مسئلہ آج بیسویں صدی میں جھگڑوں کی جڑ ہے، ایک تیرہویں صدی کا وطن پرست شاعر زبانوں کا کس طرح سے مقابلہ کر رہا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ خسرو ہندوستان کی سب عوامی بولیوں سے واقف تھے کم سے کم نام کی حد تک۔ گو ان کے اپنے لفظ یہ ہیں۔

من بہ زبان ہا کساں بیشتری
کردہ ام از طبع شناسا گذری

میں لوگوں کی اکثر زبانوں سے واقفیت رکھتا ہوں اور اپنی سمجھنے والی طبیعت کے ذریعہ ان سے واقفیت حاصل کی ہے۔

دانم و دریافتہ و گفتہ ہم
جستہ و روشن شدہ زاں بیش و کم

ان میں سے کچھ کو جانتا ہوں کچھ سے یوں ہی آگاہ ہوں کچھ میں شاعری کرتا ہوں اور زبانوں میں سے اکثر دیکھنے سے مجھ کو روشنی اور دانش حاصل ہوئی ہے۔

پھر سندھی، لاہوری (پنجابی)، کشمیری، کوبی (کبھر)، دوارسمدری (تامل)، معبری (آندھرا)، گوڑی (بہاری)، بنگالی، اودھی کے نام گناتے ہیں یہ زبانیں آج بھی رائج ہیں اور ہندوستان کے آئین میں درج ہیں مگر ہندوستان کی ان بولیوں کے علاوہ سنسکرت زبان ہے جو پرانے زمانے سے برہمنوں کے نزدیک متبرک ہے لیکن عوام کو اس کی خبر نہیں اور نہ ایک برہمن بھی اس کی حدوں سے واقف نہیں۔ اس زبان میں چار وید ہیں علم و دانش کے آئین ہیں اور قصے اور افسانے۔ سنسکرت ادب کا سلسلہ بڑھاتی ہے اور دوسروں کو سکھلاتی ہے صرف و نحو و علم و ادب میں سنسکرت عربی کے مثل ہے اور فارسی سے برتر۔

فارسی اور عربی کا معاملہ خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں کیا ہے اور فیصلہ دیا ہے۔ میں اور میری طرف معقول عذر است کہ فارسی بر عربی راجح باشد، ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ رائے پسند نہ ہو اس شعر سے جو ختم کرتی ہے۔

مرا ہر تخمی کامد زشوی خویشتن گفتم
تو ہم گر تخمی داری زشوی خویش بر کن کس

میں تو بھی دلیل پیش کرتا ہوں وہ میری اپنی ہے تیرے پاس بھی اگر کوئی دلیل ہے تو بھی اس کو سامنے لا۔

زمانہ تحسین اس لئے نہیں دیں گے کہ "منصفان بے غرض و تعصب بروں خواہند آمد" فارسی عربی کی بحث میں یہ بتایا ہے کہ عربی کی فضیلت محض شرعی ہے اس لئے اس نے اشعار میں اس سے استشہاد کیا ہے لیکن شعری نہیں۔ ثابت کیا ہے کہ تین وجہوں سے فارسی عربی پر سبقت لے جاتی ہے اول میزان فارسی میزان عربی سے بہتر ہے دوم عربی میں لفظوں کے معنی کئی ہیں اور ایک معنی میں کئی کئی لفظ ایسا فارسی میں نہیں۔ تیسرے عربی میں صرف قافیہ ہے اور فارسی میں قافیہ بھی ہے ردیف بھی کہتے ہیں۔

"پس چون شعر فارسی چشم دریں و لطائف معنی وار دو بار ردیف از بادر طبع زاید این حسن را در باد را کجا اندازہ باشد۔"

پس فارسی عربی سے بحیثیت شعر کے نقطہ نظر سے بہتر ہے اور سنسکرت "نُہ سپہر" میں کہتے ہیں اگرچہ دری شیریں و شکریں ہے لیکن سنسکرت میں ذوق عبارت اس سے کم نہیں۔" زبانوں کے موازنہ میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں عربی فارسی اور ترکی کے دنیا میں پھیلنے کا سبب بیان کرتے ہیں۔

ور بزرگی ہست کہن کاں سخنی
کس نبود از تاجوراں کس سخنی

یہی پرانا قاعدہ چلا آرہا ہے کہ بادشاہوں کے فرمانوں کے جاری کرنے یا ان کی امر و نہی کی وجہ سے زبان پھیلتی ہے۔

چو نہ کہ دمہ رسد از کف شہاں
عام شود در ہمہ اطراف جہاں

جب وہ بادشاہوں کی گفتگو سے ہو کر چھوٹے بڑے لوگوں تک پہنچتی ہے تو پھر ساری دنیا میں عام ہو جاتی ہے۔

مثالیں دی ہیں جب خلافت بغداد میں تھی تو پارسیوں کا زور رہا اور سب عرب آئین پارسی ہو گئے غوری اور ترک جن کی زبان فارسی تھی ہندوستان میں نمودار ہوئے تو ہم سب نے فارسی سیکھ لی۔ چونکہ عربی قرآن کے لئے چن لی گئی تھی اس لئے اس کی جگہ جماعت کی دنیا میں نادر ہوئی۔ اصل یہ ہے زبانیں بہت ہیں اور ہر ایک زبان میں اپنا نمک ہے۔ پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ تو رد عمل کہ میری زبان اوروں سے بہتر ہے یا یہ کہ ایک شریف قند ہے اور دوسری شرکہ یہ بیہودہ گفتگو ہے۔

زبانوں کے ساتھ علم بھی آجاتا ہے۔ خسرو یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہند کی ہوا تمام دنیا سے بہتر ہے اور صرف باغ جنت سے ایک درجہ کم تو ہمارے حکمت و دانش کا جائزہ لیتے ہیں۔ خسرو کے نزدیک یونان کا فلسفہ مشہور ہے لیکن ہندوستان نہ صرف یہی نہیں بلکہ ہر علم میں بہتر فکر کا مالک ہے۔ یہاں منطق ہے نجوم ہے اور معقولات میں برہمنوں نے ارسطو کے دفتر والوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ علم طبیعی، ریاضی، ہیئت، سب ہی ان کے یہاں ہیں مثلاً ابو معشر جو دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ستارہ شناس تھا دس برس بنارس میں رہا اور اس نے بنارس میں علم نجوم سیکھا وہ خود قبول کرتا ہے جو کچھ اس نے سیکھا وہ سب ہند کی سیاحی کی بدولت تھا۔

ہندسہ کا علم بھی ہندوستان کا وضع کیا ہوا ہے۔ صرف ان کی ایک صفر کی ایجاد سے ریاضی کے تقلیدی علم نے درجہ یقین پر پہنچے۔ صفر کی رقم دریافت کرنے کا سہرا آسا نامی عالم کے سر پر ہے اور اس کے نام کے ساتھ ہندسہ جوڑ رہے ہے ہندسہ کی اصطلاح ہی ہے۔ یونانی اور دوسرے ملک آسا ہی کے شاگرد ہیں۔

ہندوستان کی برتری یہاں ختم نہیں ہو جاتی کلیلہ دمنہ کی کتاب جو عربی حکمت کی کتاب ہے یہیں کی پیداوار ہے۔ شطرنج کا کھیل ہے جو ہند ہی کی ایجاد ہے جس سے طبیعت کھلتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی قوت بڑھتی ہے۔

زوحدت ہند اندازہ بجستہ کسی

غایت دریا یافتس نداستہ کسی

خدا اور ارادے سے بڑھ کر اس کی حقیقت کو پانے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی اس کی غایت اور انتہا کو نہ سمجھ سکا۔

ہند کا سنگیت سارے جہاں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ باہر کے لوگوں نے اسے یہاں سے سیکھا ہے لیکن ایسا ہے کہ تیس چالیس سال ریاضت کرنے پر بھی اس کی سک آواز کو ادا کرنا مشکل ہے۔ اس سنگیت میں ایسی کشش ہے کہ ہرن سن کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ تیر کمان کے سنگیت کا شعلہ اس کے دل میں پیوست ہو جاتا ہے اور بے جان کر دیتا ہے۔ فرق دیکھیے عرب کا اونٹ حدی خواں کی آواز سنتا ہے تو اور تیز چلنے لگتا ہے لیکن ہرن ہندی گانے سے ایسے حواس کھوتا ہے کہ مرنے کی نوبت آجاتی ہے۔

ہندوستان کے علم و فن سے مذہب کی طرف آتے ہیں کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے ہندو ہماری طرح دین دار نہیں ہیں پھر بھی ہمارے اکثر مسئلوں کا اقرار کرتے ہیں۔ جن اصولوں پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں: وحدت، ہستی، قدامت، عدم سے ایجاد کی قدرت، رزق دینے والے کا وجود جو ہر زندہ اور بے ہر کو رزق دیتا ہے ہر بے جان کو جان دیتا ہے اور واپس لے لیتا ہے وہ خالق ہے اور اس کی حکمت اور حکم ازلی اور ابدی ہے وہ اپنے قانون پر اختیار رکھتا ہے اور عملوں کے کرنے نہ کرنے کا مختار ہے۔

ہندو مذہب کا اور دوسروں سے موازنہ یوں کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتے ہندو ان سے کہیں بہتر اور نیک تر ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو ذات کی ہستی کے قائل نہیں لیکن برہمن اس کی ہستی کا یقین رکھتے ہیں۔ تیسرے روشنی میں یقین رکھنے والے ہیں لیکن ہندوؤں کو اس قسم کے نظریوں سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ایک فرقہ جسم کو حقیقی سمجھتا ہے مگر برہمن ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ آخری فرقہ صفات الٰہی کو مانتا ہے لیکن ہندو توحید کا قائل ہے اور رسالت سے انکار کرتا ہے۔ عنصری فرقہ چار خداؤں کا گمان رکھتا ہے مگر ہندو کہتا ہے ایک حق ہے اور اس پر قائم ہے۔ ستاروں کا فرقہ تشبیہ کی طرف مائل ہے ہندو نثر کی طرف۔ ایک فرقہ نور اور تاریکی کی تخلیق میں الجھا ہے لیکن ہندوؤں کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ برہمن اعتراف کرتا ہے کہ اس کا عقیدہ ایسا ہے کہ اس کا مثل ممکن نہیں کچھ ہندو پتھروں اور جانوروں، سورج اور درختوں کو پوجتے ہیں تو وہ ان کو مخلوق سمجھتے ہیں اور دیوی دیوتا کو مورت مان کر پرستش کرتے ہیں لیکن ان کی پرستش اپنے بڑوں کی تقلید ہے جسے وہ آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر میں اس شعر پر بحث ختم کر دیتے ہیں۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

ہر ایک قوم کا ایک مسلک اور مذہب اور قبلہ ہوتا ہے لیکن میں نے بھی اپنا قبلہ ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف سیدھا کر دیا ہے (مراد معشوق یا مرشد سے ہے)

اپنے ذاتی مذہب کے بارے میں صاف صاف بتا دیتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

میں تو عشق کا کافر ہوں مجھ کو مسلمانی کی ضرورت نہیں ہے میری ہر ایک رگ تار بن گئی ہے مجھ کو زنار کی ضرورت نہیں ہے۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند

آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بتوں کی پوجا کرتا ہے ہاں ہاں کرتا ہوں مجھ کو مخلوق سے کچھ واسطہ نہیں۔

یہاں تک تو میں نے خسرو کے کلام کے اس حصہ پر توجہ دلانے کی کوشش کی جس کا براہ راست ہند اور ہند کی تہذیب کے ساتھ تعلق ہے، اب اس مقالہ کے دوسرے جزو میں کچھ اور موضوع پر بحث ہے۔ خسرو کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مجھے ڈر ہے اگر میں اس پر کچھ لکھوں تو مضمون اتنا بڑھ جائے گا کہ آپ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگے گا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خسرو کے یہاں شعریت کی تمام خوبیاں درجہ کمال پر ملتی ہیں۔ خسرو صنائع و بدائع کے استاد اور نئی صنعتوں کے موجد ہیں۔ تشبیہ اور استعارہ میں مشکل سے کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا ہے انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھائی اور اسے اس خوب صورتی کے ساتھ نبھایا کہ باید و شاید۔ رزم کے بیان میں انتہائی جوش و خروش ہے، بزم کی تصویروں میں دلوں کو موہنے والے روپ رنگ، حمد و نعت اور پند و نصیحت کو نظم میں ایسا باندھا ہے جیسے لڑیوں میں آبدار موتی پرو دیتے ہوں۔ عشق و محبت کی داستان میں [illegible] کی کہانیاں درد بھرے لطف کے ساتھ سناتے ہیں اور دلوں کو بے چین کر دیتے ہیں۔ غرض غزلوں کے اتار چڑھاؤ کا رتن تلاتا ہے۔ کوئی پردہ کلا دست سرگم کے راگ سوار رہا ہے۔ خسرو کی شاعری ہندوستانی ماحول میں پروان چڑھی اس میں ہندوستانی رنگ چوکھا آیا۔ لیکن اس وقت موقع نہیں کہ اس طرف زیادہ دھیان دیا جائے۔

میں اس صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ خسرو کے کلام میں حکمت سیاست اور تصوف کے کیسے کیسے نادر ہیں، اس زمانہ کے ہندوستانیوں کا اخلاق کن بنیادی قدروں پر قائم تھا، سیاست کے کون سے اصول تھے جن پر حکومت کا دارومدار تھا، کس قسم کے عالمگیر نظریے تھے جو زندگی کو معمول کی سطح سے اونچا اٹھاتے تھے اور انسانی ذہنیت کو جلا دیتے تھے، کون سے اعتقاد تھے جو روحوں کی ناؤ کو لہروں کے تھپیڑوں اور ہواؤں کے جھونکوں کے باوجود کنارے کی طرف رہ نمائی کرتے تھے۔

امیر خسرو مؤرخ کی حیثیت سے

خلیق احمد نظامی

امیر خسرو کے معاصر اور دوست ضیاء الدین برنی کا بیان ہے۔

"امیر خسرو در نظم و نثر پارسی کتب خانہ تصنیف کردہ است"[1]

(امیر خسرو نے فارسی نظم و نثر میں ایک کتب خانہ تصنیف کیا ہے) ایک اور ہم عصر تذکرہ نویس میر خورد نے اس کی تصدیق اس طرح کی ہے۔

"از کتبے کہ انشا نمودہ کتب خانہ بر نشست"[2]

(ان کی تصنیف کی ہوئی کتابوں سے ایک کتب خانہ بھر گیا) لیکن ان دونوں میں سے کسی نے یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ کتابیں کن کن فن اور موضوع سے تعلق رکھتی تھیں۔ برنی نے علاء الدین خلجی کے عہد کے مشاہیر صوفیہ، علماء، شعراء، مورخین اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین کے نام گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ چشم روزگار نے باکمال لوگوں کا ایسا مجمع پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس فہرست میں امیر خسرو کا نام شعراء کے زمرہ میں آتا ہے۔ مورخین میں امیر ارسلان کلاہی، کبیر الدین بن تاج الدین عراقی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن امیر خسرو کا نام نہیں لیا گیا۔ کیا برنی کی نظر میں امیر خسرو کا مورخ کی حیثیت سے کوئی امتیازی مقام نہیں تھا؟ لندن یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر پیٹر ہارڈی نے امیر خسرو کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شاعر تھے مورخ نہ تھے[3]۔ اگر اس رائے کا مقصد صرف یہ خیال ہے کہ ان کی ادبی کاوشوں کا حقیقی مرکز اور محور شاعری تھی، تو اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں، لیکن اگر اس کا مقصد امیر خسرو کی تصانیف کی تاریخی اہمیت اور افادیت کو کم کرنا ہے تو یہ رائے غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ اگر تاریخ نام ہے صرف سیاسی واقعات کی کھتونی کا، تو امیر خسرو یقیناً مورخ نہیں تھے، لیکن اگر تاریخ عبارت ہے انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو کی تعبیر و تفسیر سے، تو امیر خسرو کی تصانیف ہمارے تاریخی ادب کا بہترین سرمایہ، اور قرون وسطیٰ کی تہذیب کی بہترین آئینہ دار ہیں۔ عصر حاضر کا مورخ جب ہندی قرون وسطیٰ کی تہذیب اور اس کے جلوۂ صد رنگ کا جائزہ لینا چاہتا ہے تو اس کو اپنی معلومات کا سب سے بڑا سرچشمہ امیر خسرو ہی کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی ان مثنویوں میں بھی جن کا بظاہر ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہندوستانی تہذیب کے رنگ و بو ہی سے اپنے مرقعے سجائے ہیں۔ اس عہد کی روح، جس کو سمجھے بغیر تاریخی عوامل کا تجزیہ ممکن نہیں، ان کی تصانیف کے ہر صفحے پر متحرک نظر آتی ہے۔ امیر خسرو نے ماضی کی داستانیں نہیں لکھیں، اپنے مشاہدات بیان کئے ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

من از دیدہ خویش گویم سخن

نہ از افسانہ و داستان کہن[4]

اور ان مشاہدات کا تنوع، ان کے ذہن اور نظر کی وسعت کا زندہ ثبوت ہے۔ تماشاگاہ عالم کو انھوں نے ہر ہر پہلو سے دیکھا تھا۔ کبھی دربار شاہی سے اس پر نظر ڈالی، کبھی خانقاہوں میں بیٹھ کر اس کی حقیقت کو سمجھنے کی جستجو کی۔ بادشاہوں کی لغزشوں کو جو حاصل ریاست سمجھے جاتے تھے انھیں بھی قریب سے دیکھا، جنھوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا ان کے پاس بھی بیٹھے، "ولایت در یک دلو" کی شان کا بھی جائزہ لیا اور زہد و تقویٰ اور ریاضت و مجاہدہ کی زندگی کا بھی مزہ چکھا۔ لڑائی کے میدان میں انسانی جسموں کو پارہ پارہ ہوتے اور خانقاہوں میں انسانی دلوں کو جوڑتے ہوئے بھی دیکھا۔ بادشاہوں کی ہوس ملک گیری کے تماشے بھی دیکھے اور زبان سنان سے محتاج مفلسوں کے دل کی دھڑکنوں کو بھی سنا۔ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل بھی کہی اور خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات بھی کی۔ دہلی سے ارنگل اور ملتان سے لکھنوتی تک ہندوستان کے ہر ہر گوشے میں پہنچے۔ یہاں کے پہاڑ، دریا، صحرا، موسم، پھل پھول، جانور، زبانیں، رسم و رواج ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا۔ ہندوستانی زندگی کے اس وسیع اور بھرپور تجربہ نے جو بصیرت ان میں پیدا کر دی تھی، وہ ان کی تاریخی تصانیف میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

امیر خسرو کا تاریخی مطمح نظر دربار تک محدود نہیں تھا۔ وہ دربار میں رہتے ہوئے بھی، دربار کے نہیں تھے۔ افواج میں ملازم ہونے کے باوجود جنگ و جدال سے نفرت کرتے تھے۔ کوکبۂ شاہی کی چمک دمک ان کی آنکھوں کو کبھی خیرہ نہ کر سکی اور عوام کی زندگی ہی ان کی دلچسپیوں کا مرکز رہی۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی جو تصانیف ہم تک نہ پہنچ سکیں اور ضائع ہو گئیں وہ غالباً وہ تھیں جن کا تعلق بادشاہوں سے نہیں تھا بلفظ دیگر جو عوام سے متعلق تھیں۔ بادشاہوں سے متعلق لٹریچر کے تحفظ کا اہتمام تو شاہی کاتب اور مصوروں نے کر دیا، دوسرے لٹریچر کو یہ سہولت میسر نہ آسکی اور دست برد زمانہ

1. تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹ 2. سیر الاولیاء ص ۳۰۲ 3. HISTORIANS OF MEDIEVAL INDIA, ص ۹۴ 4. نہ سپہر صفحہ ۹۳

...ند، ہو گیا عالم سیہ پوش کر رہ گیا۔
...کہ انھوں نے اپنی مثنویوں میں بادشاہوں کی امایت لکھی تھیں لیکن ...حالی تھی اُن کے تصور کی ہمہ گیری کو مات نہ کر سکی تھی۔ انھوں نے جو اہم کی ...کشی اور رزم و بزم کی داستانیں بیان کرنے کی کرتے جب طبیعت ...اکتا جاتی ہے تو ان کا ذوق انھیں گوشوں کی طرف لے جاتا ہے جو عوامی زندگی سے متعلق ہیں اور جہاں کچھ دیر کے لئے وہ صحراؤں، جنگلوں، دریاؤں، رسوم و رواج کا ذکر کر کے اپنے سر کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ یہاں وہ زندگی کی حقیقتوں سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں اور اُن کی شاعری انسانی فطرت سے سرگوشیاں کرتی نظر آتی ہے۔ دکن میں علاء الدین خلجی کی فتوحات کا نقشہ کھینچنے پر پورا زور قلم صرف کر دیتے ہیں لیکن ایک مختصر سے جملے میں اس ساری کارروائی کا تاثر اس طرح ظاہر کر دیتے ہیں۔ تم بردی العظام فی الارض۔

علاء الدین خلجی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں ملک گیری کی ہوس کے خلاف اُن کے حقیقی جذبات متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور سلطان کی روح سے مخاطب ہو کر کہا۔

چو ہر کرد خاک، آمد بار خاک ست
خوش آں کس کہ کرم خود را پاک ست
جہاں بادگر ہست آں کشور و سپہر
کزاں بہرہ مشتی از خاک گر سپہر

123738
20 3 95

قرون وسطی کے لٹریچر کو صحیح پس منظر میں سمجھنے اور صحیح نتائج اخذ کرنے کے لئے مصنف کی نفسیات، اس کے ذہنی محرکات، ماحول اور انداز بیان کا تجزیہ کرنا از بس ضروری ہے۔ اس طرح نہ صرف مصنف کی شخصیت بے نقاب سامنے آجاتی ہے بلکہ اس کی فکر اور اس کے جذبات تک بھی رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ امیر خسرو کی ہر تصنیف ایک علیحدہ ذہنی اور جذباتی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ کیقباد کے ہنگامہ ہائے ناؤ نوش سے طبیعت متنفر ہے، لیکن سلطان کی زندگی اس کے علاوہ اور ہے کیا، ذہن دوسرے مناظر اور کھیتوں کی نقش گری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اُس عہد کے خاتمہ کا اعلان کرتی ہے جس میں اُن کے باپ امیر سیف الدین محمود نے عزت اور شہرت حاصل کی تھی اور التتمش کی فتوحات کا دائرہ بڑھانے میں معاون ہوئے تھے۔ ان ترک امراء کے سایہ میں خود امیر خسرو کے دور بچپن نے پرورش پائی تھی، اب وہ عہد ختم ہوتا ہے اور اس کے بعض آثار پارینہ نظر آتے ہیں اُس منظر سے ان کا دل روتا ہے لیکن چہرہ پر مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ علاء الدین خلجی کے عزم ملک گیری میں ان کو التتمش کے ادھورے خواب کی تعبیر دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی فتوحات میں تباہی و بربادی کے مناظر اُن سے برداشت نہیں ہوئے۔ وہ "ملک گیری" کے معاملہ میں "نظم ونسق" کو ترجیح دے کر سلطان کی ان کوششوں کا ذکر کرنے لگتے ہیں جن کا مقصد اخلاق کی درستگی اور ایک بہتر معاشرہ کی تشکیل تھا۔ مبارک خلجی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن نظر اس کے معائب سے نظر نہیں ہٹتی اور جگہ جگہ اپنے مخصوص انداز میں اس پر گرفت کرتے جاتے ہیں۔ امیر خسرو کی تاریخی تصانیف کے سرسری مطالعہ سے شاید یہ گمان ہو کہ وہ سب بادشاہوں کی ایک سی ہی تعریف کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، لیکن اگر ذرا گہرائی میں اُترا جائے تو تعصبات کے نازک تار و پود نظر آنے لگتے ہیں۔

تاریخی اہمیت کے پیش نظر اگر امیر خسرو کی تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو پورے لٹریچر کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پانچ دیوان "تحفۃ الصغر" "وسط الحیوٰۃ" "غرۃ الکمال" "بقیہ نقیہ" "نہایت الکمال" جن کی بنیادی نوعیت ادبی ہے لیکن ان میں ایسے قصائد شامل ہیں جن سے اس عہد کی بعض اہم شخصیتوں اور اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۲) خمسہ "مطلع الانوار" "شیریں خسرو" "آئینہ سکندری"، "ہشت بہشت" "مجنوں لیلیٰ"۔ ان مثنویوں کا موضوع صحیح ہندوستان سے تعلق نہیں رکھتا لیکن ان میں جگہ جگہ ہندوستانی تہذیب اور معاشرت سے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے امیر خسرو کی مثنوی نگاری کو "تاریخی ثقافتی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) "اعجاز خسروی" ضخیم نثری کارنامہ ہے جس میں انشاء کے نمونے درج ہیں بعض اہم تاریخی دستاویزات بھی اس میں شامل ہیں جن سے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) تاریخی مثنویاں اور تاریخ "قران السعدین" "مفتاح الفتوح" "دولرانی خضر خاں" "تغلق نامہ" اور "خزائن الفتوح"۔ ان سب کا موضوع تاریخی ہے اور اس عہد کے مختلف سیاسی اور تہذیبی حالات کے لئے متن کا ماخذ کی حیثیت ہے۔ اس لٹریچر کی تاریخی اہمیت کو سمجھنے کے لئے بعض حقائق کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ادب کی ہر صنف خواہ وہ قصیدہ ہو یا مثنوی، تاریخ ہو یا تذکرہ ایک علیحدہ انداز بیان ہوتا ہے جس کی پابندی مروجہ اصولوں کے مطابق ہر شاعر اور انشاء پرداز کو کرنی پڑتی ہے۔ قصائد کے بہت سے حصے محض ریاست کے لئے ہوتے ہیں اس طرح کی اصناف سخن سے تمام حشو و زوائد کو علیحدہ کر کے ہی تاریخی حقائق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خود امیر خسرو کا خیال تھا ۔

کارائش کردی زحد بیش
رخسارۂ قصہ راکند ریش

(۲) نثر لٹریچر بادشاہوں کے ملاحظہ کے لئے اکثر اُن کی ایماء پر وجود میں آتا تھا۔ شاعری اور پھر درباری آداب، دونوں کا تقاضہ تھا کہ عبارت آرائی اور زور سخن میں پوری کوشش کی جائے۔ قرون وسطی میں جب کوئی نیا علاقہ فتح ہوتا تھا تو "فتح نامے" لکھوا کر دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے تھے اور ان میں پورا زور بیان صرف کیا جاتا تھا۔ یہی انداز تاریخوں کے لئے بھی اختیار کر لیا گیا تھا۔ اس لٹریچر میں مبالغہ آرائی کی حیثیت بالکل زرق برق لباس کی ہے جس کے اندر اصل جسم پوشیدہ ہوتا ہے۔ کارلائل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مصنف کا انداز بیان اس کا جسم ہے۔

...... ماں ہیں اگر مبالغہ آرائی کا لبادہ اتار دیا جائے تو حقیقت بالکل واضح نظر آجاتی ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی نے صحیح لکھا ہے کہ امیر داستاں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شاعری کے سانچے میں حقیقت بے ستر عریاں نظر آتی ہے:

(۳) تاریخی اعتبار سے ان تصانیف کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ امیر خسرو خود ان واقعات کے شاہد ہیں۔ اس لئے جزئیات اور تفصیل کو واقعات کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ عمارتوں کی تصویر، موسموں کی تفصیل، لباس کی جزئیات سے وہ ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ دور زندہ ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ زمان و مکان کی ساری بندشیں ٹوٹ چکی ہیں اور ہم اسی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔

(۴) امیر خسرو نے اکثر جگہ واقعات کی تاریخی ترتیب کا خیال رکھا ہے اور سن کی پابندی کی ہے۔ ضیاء الدین برنی کے یہاں تاریخوں کا فقدان ہے۔ معاصر مورخین کی اس کوتاہی کو امیر خسرو نے بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک خلجی اور غیاث الدین تغلق کے عہد کے بہت سے واقعات کی تاریخی ترتیب، امیر خسرو کی تصانیف ہی کی بنا پر کی گئی ہے۔

(۵) ہندوستان کے مختلف مقامات سے ذاتی واقفیت کی بنا پر انھوں نے شہروں اور قصبات کا جو حال لکھا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ "مفتاح الفتوح" اور "خزائن الفتوح" میں مختلف مہمات کے سلسلہ میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے اس سے تاریخی واقعات کو صحیح پس منظر میں سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(۶) امیر خسرو نے مختلف موقعوں پر اپنے جذبات کو خاموش لیکن مضبوط طریقہ پر ظاہر کر دیا ہے۔ بعض جگہ واقعات کی تفصیل اس انداز سے دی ہے کہ ایک تاریخی ذہن ان میں زوال کے اثرات کا صاف اندازہ لگا سکتا ہے "نہ سپہر" میں مبارک خلجی کی شکار میں دلچسپی اور بزم آرائیوں کا نقشہ، خلجیوں کی بربادی کی پیش گوئی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ "قران السعدین" میں کیقباد کے دربار کے ہنگامہ ہائے ناؤ نوش شاہی خاندان کی تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"تحفۃ الصغر" امیر خسرو کے ۱۶ سال سے ۱۹ سال کی عمر تک کے کلام پر مشتمل ہے اس میں بلبن، شہزادہ محمد، حاتم خاں، اختیار الدین، کشلو خاں، قوام الملک، عزیز الدین کے نام قصائد شامل ہیں جن سے اس دور کے امرا کے حالات کی ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے۔ "وسط الحیوٰۃ" میں ۲۲ سال کی عمر کا کلام ہے۔ اس میں ۵۸ قصائد شامل ہیں۔ جن کا تاریخی مواد تیرہویں صدی کی تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ منگولوں کے حملوں، شہزادہ محمد کی شہادت اور طغرل کی ہزیمت کا تفصیلی حال ان میں موجود ہے۔ منگولوں نے ایک جنگ میں امیر خسرو کو بھی قید کر لیا تھا۔ اسی پریشانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

اسیر گشتم و ز بیم آں کہ خوں ریزد
نمی نماند زخوں در تنِ نحیف و نزار

جو منگول اُن کو گرفتار کر کے لے جا رہا تھا اس کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

فرو ز کہ مرا اسپ کردہ رہ می رفت — نشستہ بر فرسے چو پلنگ در کہسار
کشادہ از دہنش گندے چو لوتے بغل — فتادہ بر زنخش سبلتے چو موئے زہار
زماندگی ودمے گر نماندے تشنہ — گہے طلایہ کشندے بخشم گہ تکرار

منگولوں کی جو تصویر انھوں نے پیش کی ہے وہ اس دور کے تاریخی لٹریچر میں سب سے زیادہ مکمل نظر آتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں، موٹا تھما تھا چہرہ، چپٹی ناک پھیلے تھے، داڑھی کے دو چار بال ٹھوڑی سے لٹکے ہوئے، لمبی لمبی مونچھیں، گھٹا ہوا سر۔ تاتاری زبان میں نعرے لگاتے ہوئے۔ یہ تھے منگول جنھوں نے تیرہویں صدی کے ہندوستان میں آگ اور خون کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

"غرۃ الکمال" میں امیر خسرو کا ۳۴ سال سے ۴۳ سال کی عمر تک کا کلام شامل ہے۔ دیباچہ میں مختصراً اپنے حالات بیان کرتے ہوئے اس عہد کے ادبی رجحانات کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں۔ فارسی اور عربی شاعری کی بنیادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کے بیان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فارسی کے ذریعہ ملک میں ایک انتظامی یکسانیت پیدا ہو گئی تھی۔ "غرۃ الکمال" میں ۹ سے زیادہ قصیدے ہیں جن میں خلجی سلاطین اور شہزادوں مثلاً ارکلی خاں، الماس بیگ، الغ خاں کے سب بحسب حالات درج ہیں۔ علاء الدین خلجی کے ایک بیٹے کی پیدائش پر جو قصیدہ لکھا ہے اس میں دہلی کی زینت و آرائش اور اس کی تمدنی زندگی کی ایک دلآویز تصویر پیش کی ہے۔ "بقیہ نقیہ" میں علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد کا کلام ہے۔ اس میں ۶۲ قصیدے ہیں جو قطب الدین مبارک خلجی، الماس بیگ، تاج الدین دبیر وغیرہ کے نام ہیں۔ رمضان اور عید پر بھی نظمیں شامل ہیں جن میں اس دور کی مذہبی زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ "نہایۃ الکمال" امیر خسرو کا آخری دیوان ہے جس میں تغلق سلاطین، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے نام قصائد ہیں۔ ایک مثنوی "در تعریف تغلق آباد" ہے جس میں دورِ تغلق کی اس نئی آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثنوی "صفۃ الاوصاف" میں قطب آباد (دیوگیر) کا حال لکھا ہے۔ یہ مثنوی تاریخی اعتبار سے بے حد اہم ہے الغ خاں جو بعد کو محمد بن تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا، ۲۲، ۱۳ء میں دیوگیر کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں دیوگیر کا نام قطب آباد تھا امیر خسرو بھی اس کے ساتھ گئے تھے۔ انھوں نے جس طرح اس شہر کی آبادی جغرافیائی خوبیوں اور موسم کی دلکشی کا ذکر کیا ہے اس کے پس منظر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ جب محمد بن تغلق نے دیوگیر کو ایک جنوبی دارالسلطنت کی شکل دینی چاہی تو امیر خسرو کے خیالات کا اثر بھی اس کے ذہن پر کام کر رہا تھا۔

"خمسہ" ایک ادبی شاہکار ہے جس میں امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے مشہور ادبی کارنامے کا جواب دے کر ہندوستان کی علمی سربلندی کا سامان مہیا کیا ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان کی معاشرت اور تہذیب کے متعلق نہایت اہم اور دلچسپ حوالے ملتے ہیں۔ یہاں کے جانوروں، پھل پھول، کپڑوں، فنون، سنگتراشی، مذہبی رسوم، شطرنج، سازِ موسیقی وغیرہ کے متعلق جو تفصیلات اس میں بکھری ہوئی ہیں اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تمدنی زندگی کے بہت سے گوشے روشن ہو جائیں گے۔

یہ اعجاز خسروی کو امیر خسرو نے ۳۶ سال کی عمر میں مکمل کیا تھا۔ اس میں اُن کی بڑی تصانیف اور ابتدائی دور کے کچھ رسائل بھی شامل ہیں۔ گو اس تصنیف کا بنیادی مقصد اپنی انشا پردازی کا سکہ بٹھانا ہے لیکن اس میں جو خطوط و اسناد درج ہیں ان سے ہمیں اس دور کی بھی ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر ایک طرف سرحدی تاجروں کی سرگرمیاں اور عصر سماجی عناصر کی تصویر کشی نمایاں کی گئی ہیں تو دوسری طرف موسیقی کے مختلف طرز، اساتذہ کے مختلف اسالیب اور زبان و بیان کے مختلف لوازم کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ موسیقی کی ایک ماہر ترمیتی جالوں کا ذکر اور پانی کی جو ہوں کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ سیاسی حالات کے سلسلہ میں بلبن کا فتح نامہ لکھنوتی اور علاء الدین خلجی کا وہ فرمان جو عہد بلبنی کے دور آغاز میں جاری کیا گیا تھا ایسی دستاویزیں ہیں جن کو تاریخ کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس لٹریچر سے قطع نظر جس کی حیثیت ادبی ہے، امیر خسرو کی دیگر تصانیف تاریخی معلومات کا ایک گنجینہ ہیں جن کے مطالعہ سے تاریخ کے طالب علم کو صرف سیاسی واقعات ہی سے آگاہی نہیں ہوتی بلکہ اس دور کے فوجی نظام، ادبی ماحول، سماجی اور تمدنی حالات کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

تاریخی مثنویوں میں سرفہرست "قران السعدین" کا نام آتا ہے۔ یہ مثنوی کیقباد کی فرمائش پر رمضان ۶۸۸ھ مطابق ستمبر ۱۲۸۹ء کو مکمل ہوئی۔ بلبن کا جب انتقال ہوا تو اس کا بیٹا بغرا خاں بنگال کا گورنر تھا۔ دہلی میں امرا نے اس کے بیٹے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ باپ نے بنگال میں آزاد حکومت کا اعلان کر دیا جس پر سیاسی کشمکش کا آغاز ہوا اور فوج کشی تک نوبت پہنچ گئی۔ پھر کچھ دنوں تک نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اودھ میں دونوں کی ملاقات ہو۔ امیر خسرو اس موقع پر کیقباد کے ساتھ اودھ گئے تھے اور سلطان کی دہلی واپسی کے بعد بھی دو سال تک وہاں رہے تھے۔ جب دہلی واپس آئے تو سلطان نے اُن کو ندیم بنایا اور مثنوی لکھنے کا حکم دیا۔ "قران السعدین" امیر خسرو کے ابتدائی زمانہ کا کارنامہ ہے لیکن زبان و بیان کی خوبی، دہلی اور اودھ کے سماجی ماحول کی تصویر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ بعض ناقدین نے اعتراض کیا ہے کہ اس میں اصل مضمون کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ دوسرے مباحث زیادہ ہیں۔ امیر خسرو کو اس بات کا احساس تھا۔ اس کا سبب بتاتے ہیں ؎

جوں سخن از لطف لبالب بداشت   کالبدش صورت حالے نداشت
وصف بران گونہ فزو راندہ ام   کز غرض قصہ فرو ماندہ ام

کہتے ہیں کہ میں نے صلہ کی طمع میں یہ مثنوی نہیں لکھی، میرا سخن بجائے خود ایک خزانہ ہے۔ اس کے سامنے گنج زر کی کیا حقیقت ہے۔ شاعری کی بدولت مجھ کو جو صلہ ملتا ہے اس کو دو چند کر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ اگر سلطان مجھ کو فریدوں و جمشید کا سا خزانہ بھی عطا کرے تو میرے ایک حرف کا بھی صلہ نہ ہوگا۔

من کہ نہادم ز سخن گنج پاک   گنج زر اندر نظرم چیست خاک
در ندہم گنج فریدون و جم   ہر یک حرف بود بلکہ کم

مثنوی میں ایسی بہت سی تفصیلات ہیں جن سے اس دور کے تمدنی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً دہلی کی تمدنی حالت، جامع مسجد، منارہ، حوض، شہر نو، قصر نو وغیرہ کا حال کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتا۔

کیقباد، عیش و عشرت کا دلدادہ اور شاہد و شراب کا متوالا تھا۔ امیر خسرو نے اس کو نصیحت کرنے اور اس کے کردار کے ان پہلوؤں پر تبصرہ کرنے میں بڑی جرأت اور بے باکی کا ثبوت دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

ترک طمع گیر و ز خود شرم دار   تا نشوی چوں دگراں شرمسار
گر سر رائی کہ در رخ نگماشتہ   ان ز ملک می طلبی برداشتہ
غرہ بہ مردی کہ سلطان مشو   ملک نامی مگس خوان مشو
ہست دے از حرم ہستی جے   تا لوح پاشی کہ کمی رو سے

اس کے بعد امیر خسرو نے ایک مختصر مثنوی "مفتاح الفتوح" لکھی۔ اس میں جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اور ابتدائی مہمات کا حال درج ہے۔ یہ تفصیل کسی دوسری معاصر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مثنوی میں امیر خسرو کے لئے ایک مشکل مقام وہ آیا ہے جہاں ملک چھجو کو باغی کی حیثیت سے پیش کرنا پڑا ہے۔ ملک چھجو اُن کے بالکل ابتدائی محسنوں میں تھا اور ایک زمانہ میں اس کے متعلق انھوں نے لکھا تھا ؎

صبح رانگفتم کہ خورشید کجا است   آسماں بندہ ملک چھجو بود

لیکن اس مثنوی میں ایک باغی کی حیثیت سے اس کی مذمت کرنی پڑی تھی۔ قدیم تعلقات نے اُن کا قلم روک لیا اور انھوں نے چھجو کو صرف "بد عہد" کہنے پر اکتفا کیا۔

"دولرانی خضر خاں" جو "عشقیہ" کے نام سے بھی مشہور ہے، اُن کی مثنویوں میں اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد شاعرانہ تخیل سے زیادہ واقعات پر ہے۔ خضر خاں نے ایک دن امیر خسرو کو بلایا اور دولرانی سے اپنے عشق کی داستان جو اس نے لکھی تھی دے کر درخواست کی کہ اس کو نظم میں منتقل کر دیں۔ امیر خسرو نے اس کام کو بڑے خلوص اور ہمدردی سے انجام دیا اور ۷۱۵ھ کو یہ مثنوی پوری ہوگئی۔ بعد کو جن دردناک حالات میں خضر خاں کا خاتمہ ہوا اس سے امیر خسرو کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوگیا اور انھوں نے غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں اس میں اضافہ کیا اور علاء الدین خلجی کی بیماری، ملک کافور کی احسان فراموشی اور خضر خاں کے قتل کی پوری داستان اس میں شامل کر دی۔ امیر خسرو کو خضر خاں سے خاص تعلق خاطر تھا۔ غالباً اس کی ایک وجہ اس کی حضرت محبوب الٰہی سے عقیدت بھی تھی۔ مثنوی کے شروع میں امیر خسرو نے نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ علاء الدین خلجی کو نصیحتیں کی ہیں اور ظلم کے نتائج اور شراب نوشی کی تباہی سے آگاہ کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ سلاطین دہلی کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ اور ہر ایک سلطان کے متعلق جو رائے دی ہے وہ اس کی سیرت اور کارناموں کا بہترین خلاصہ ہے۔ رضیہ کے

متعلق لکھتے ہیں ؎

چناں میراند زور دادہ شہاں کہ عالم می شد ندانرد ہے دلیراں

ناصر الدین محمود کے متعلق لکھتے ہیں ؎

خود اد مسند کار الٰہی نامرس بندگان درگاہ شاہی

علاء الدین خلجی کی فتوحات جن کے متعلق امیر خسرو نے "خزائن الفتوح" لکھی یہ نثر میں ان کی پہلی تصنیف تھی۔ لکھتے ہیں۔

"در دکور نظم فرادان گوہر سودہ بودم در انبار ہا ہی
لالی گرد آوردہ۔ خواستم کہ برائے سندہ دالا
نثری بر بیارایم"

لیکن جیسا کہ پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے نظم امیر خسرو کی مادری زبان تھی، نثر لکھنے میں ان کو تکلف کرنا پڑتا تھا۔ گو امیر خسرو نے صاحب "تاج المآثر" کا ذکر نہیں کیا لیکن انداز بیان میں اسی کا اتباع کیا ہے۔

"خزائن الفتوح" میں فتح دیوگیر سے لے کر "فتح ارنگل" تک کا ذکر ہے اور کتاب کا دو تہائی حصہ اسی سے متعلق ہے۔ لیکن اور بہت سے دلچسپ مباحث بھی اس میں آ گئے ہیں، مثلاً اسیاء کے نرخ کا تعین، شراب نوشی کا انسداد، اباحتوں کی سرزنش، دار العدل کا قیام، مسجدوں، حوضوں اور فصیلوں کی تعمیر علاوہ ازیں منگولوں کے حملوں کی تفصیل اور فتح گجرات کا حال بھی اس میں درج ہے بعض معاملات پر اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے درباری مورخ کبیر الدین نے اپنے فتح نامہ میں جن مباحث پر تفصیلی گفتگو کی تھی ان کو دہرانا غیر ضروری تھا۔ قرون وسطیٰ کے فوجی نظام کے متعلق جو مواد اس تصنیف میں ملتا ہے وہ گراں قدر ہے۔ امیر خسرو سپاہی تھے، اس لئے فوجوں کی ترتیب، نقل و حرکت کی تفصیلات خوبی سے بیان کرتے ہیں۔

مثنوی "نہ سپہر" مبارک شاہ خلجی کے حکم پر لکھی گئی تھی۔ سلطان کی تخت نشینی، دیوگیر کی مہم، ورنگل کی مکمل، جامع مسجد کی تعمیر کے علاوہ دہلی سے متعلق ایک حصہ ہے جس میں دنیا کے مشہور شہروں سے دہلی کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اس کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدیم ہندوستان کے تہذیبی کارناموں کے ساتھ ساتھ یہاں کی آب و ہوا، پھل پھول، پرند چرند، مذاہب، رسوم اور زبانوں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ایک باب میں بادشاہ اور امراء کے لئے کچھ نصائح ہیں جن سے امیر خسرو کی سیاسی افکار و نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک شہزادہ کی ولادت پر شاہی محل میں جشن کی تفصیل ہے یہ ساری معلومات ہندوستان کی تمدنی تاریخ کا نہایت اہم اور قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔

ہر چند کہ سلطان مبارک خلجی کے تعلقات امیر خسرو کے شیخ حضرت محبوب الٰہیؒ سے اچھے نہ تھے اور قطب الدین مبارک وہ کھلے دربار میں ان کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہا کرتا تھا۔ امیر خسرو نے نہایت دلیری اور ہمت کے ساتھ "نہ سپہر" میں اپنے مرشد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

من از دے لعاب دہاں یافتم
کہ زیں گونہ آب دہاں یافتم

"تغلق نامہ" میں امیر خسرو نے خلجیوں کی بربادی اور تغلق خاندان کی سریر آرائی کی پوری داستان بیان کی ہے۔ غازی ملک نے کس طرح خسرو خان سے خاندان علائی کو ملیا میٹ کر دینے کا بدلہ لیا اور کن نامساعد حالات میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس کی تفصیل "تغلق نامہ" کے علاوہ اس عہد کی کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ امیر خسرو کی آخری تصنیف تھی۔ اس کے ساتھ تاریخی مثنویوں کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا جس کی ابتدا "قران السعدین" سے ہوئی تھی۔ اگر امیر خسرو کی یہ تصانیف میسر نہ ہوتیں تو قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اور تمدن کے کتنے گوشے تشنۂ تعبیر و تعبیر رہ جاتے۔

بقیہ - امیر خسرو کے عہد کا دہلی

ڈاک کا انتظام

ڈاک دو قسم کی ہوتی تھی۔ ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو اولاق کہتے تھے مقررہ فاصلہ کے بعد گھوڑا بدلا جاتا تھا۔ لیکن سوار ڈاک لے کر سفر جاری رکھتا تھا گھوڑوں کا انتظام حکومت کی جانب سے ملازمان دیہی کے توسط سے ہوتا تھا۔ گھوڑا بدلنے اور تازہ دم گھوڑوں کو مہیا اور تیار رکھنے کی وجہ سے تیز رفتاری کو قائم رکھا جا سکتا تھا۔ پیدل ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ہر کاروں کے یا ہر سرکاروں کی چوکیاں ہوتی تھیں جن کو داوہ کہتے تھے۔ یہاں ہر جماں سی ہوتی تھیں اور ہرکارہ کر کسے بیٹھے رہتے تھے جب شہر سے ڈاک چلتی تو ہرکارہ ایک ہاتھ میں ڈاک رکھتا اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھڑی دو گز لمبی ہوتی جس کے سرے پر گھنگرو بندھے ہوتے مقررہ فاصلہ پر دوسرا ہرکارہ گھنگرو کی آواز سن کر تیار ہو جاتا۔ اور جب ہرکارہ چوکی تک پہنچ جاتا تو اس سے ڈاک لے کر فوری روانہ ہو جاتا اس طرح ڈاک مسلسل حرکت میں رہتی۔ کبھی اس ڈاک کے ذریعہ دور دراز کے تازہ میوے اور کبھی کسی خاص مقام کا صحت بخش پانی بھی بادشاہ کو پہنچایا جاتا خبریں بھی اسی ذریعہ سے بھیجی جاتی تھیں۔

بقیہ - "امیر خسرو کی حب الوطنی"

مسلمان ہو یا ہندو، جو بھی خلوصِ سے دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ اپنے اس عمل میں حق بجانب ہے۔ ہر ایک پجاری اللہ کی عبادت محبت سے کرتا ہے محبت اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جس شخص کو پوری باطنی نظر حاصل ہے وہ ہر چیز میں اللہ کا جلوہ دیکھتا ہے چاہے وہ یہ عبادت کسی وسیلے سے ہی کیوں نہ کرتا ہو۔

ساتھ اور راست رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ خسرو کی زبان و اسلوب کو مرتب و صحیح
امیر خسرو کی شاعری میں تدبر، تعقل اور تحقیق کے رویے نمایاں ہیں اور جذبہ و
احساس کی معقول صورت زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کی مثنویوں کا تاریخی مواد روایتی
تجربہ اور ماحول پر ہے اور ان کا تخیل حقیقت سے دامن کشاں نہیں ہوا۔

شاعری میں صنعت داراییت کے تجربوں کے سلسلے میں بھی امیر خسرو کا
مطالعہ بھی دامن نہیں لوٹاتا۔ استعمالِ قوافی اور صنعت معنی کے علاوہ مثنوی
"نہ سپہر" میں نو بحروں کا تجربہ قابلِ غور ہے۔ آپ کی مختلف البحور اور کثیر الاوزان
نظموں کا سب نامہ سات صورتوں سے سرِ دیع کیا جا سکتا ہے۔ ملوکیت اور
تصوف سے قریبی تعلق کے باوصف امیر خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے
انسانی وجود کا احاطہ کرنے والے رنج و غم اور انبساط و مسرت کے لمحات ان کی شاعری
میں کثرت سے ملتے ہیں۔ مطرب اور ہمدمِ دلوں سے بیک وقت لطف اندوز
اور مستفید ہونے والی طبیعت امیر خسرو کو ملی ہے۔ "عہد مد" شاعر کی بہت سی مہمات
امیر خسرو کو بھی درپیش تھیں، جن میں سے ایک بہت بڑی مہم یہ تھی کہ اس زمانے کے
سیاسی ESTABLISHMENT سے روابط اور خانقاہ سے تقرب و ... حاصل کر کے
بھی اپنی انفرادیت اور ذات کی شناخت کو کیسے قائم رکھا جائے۔ وہ ہر محفل
اور ہر منصب میں گھل مل کر جاتے ہیں۔ بالکل پانی کی طرح کہ جس میں مل جاتا ہے
ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتا ہے لیکن اپنی بھی روانی کو نہیں کھوتا۔

امیر خسرو کی ہشت پہلو اور جامع صفات شخصیت کے تمام پہلو ہر زمانے کے
لوگوں کے لئے دلچسپی، افادیت اور معنویت رکھتے ہیں۔ ایک ذہین اور حساس
انسان کی حیثیت سے جس نے اپنے عہد کے مروجہ تمام علوم کی آگاہی حاصل کی،
ایک مورخ جس نے منظوم پیرائے میں اپنے عہد کے واقعات و حالات اور مظاہر و
مناظر کو شاعرانہ حسن و خوبی کے ساتھ بیان کر دیا اور اپنے عہد کی سماجی، معاشی اور
معاشرتی حقیقتوں کو عمرانی نقطہ نگاہ سے گرفت کرنے کی کوشش کی، اور ایک شاعر جس
نے فارسی کو "ہندیا" لیا اور ترک ہونے کے باوجود مقامی زبانوں اور اسالیب
کو اپنایا اور برتا۔ امیر خسرو کی موسیقی دانی پر تو کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا
لیکن ان کا اس میں ذاتی دخل اور تجربہ کسی اندرونی یا عصری شہادت کے بغیر مشکوک
ضرور ہے۔ اسی طرح ان کی ہندی شاعری کے نمونے بھی تاحال مستند و معتبر قرار
نہیں دئے جا سکے۔ عصرِ حاضر میں امیر خسرو کے متعلق عقیدتوں کے بے بنیاد پہلوؤں
سے گزر کر امیر خسرو کی ذات تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ ان کے دواوین کے
دیباچے اور "اعجازِ خسروی" کے رسائل کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ نہ صرف سبک
ہندی کی فارسی بلکہ تیرھویں چودھویں صدی کی ہندوستانی لسانیات، معنویات
اور اسلوبیات کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ مثلاً "غرۃ الکمال" کے
دیباچے میں عربی اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ تنقیدی شعور کا ثبوت دیتا ہے
اسی دیباچے میں شعر میں چار اشکال کا ذکر ملتا ہے۔ یابس، معتدل، رطب اور
مرن۔ یابس میں صنعتِ لفظی کا غلبہ ہوتا ہے جو نظم میں عیب اور نثر میں ہنر۔ معتدل
وہ شکل ہے جس میں صنعتِ لفظی موجود تو رہتی ہے مگر سلاست نہیں کھوتی اور طراوت
بھی رکھتی ہے۔ رطب میں سلاست و صفائی غالب رہتی ہے اور رعایتِ لفظی
بہ تکلف نہیں برتی بلکہ ان میں رعایت بے ارادہ طریقے سے آجائے تو آجائے ورنہ
یہ شکل ایسی ہے کہ آگ کی طرح مئے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نہ وہ
روحانی شراب ہے جو کاسۂ سرِ شاعر میں کھینچی جاتی ہے اور نہ جدائی لذت رکھتی ہے
اسی دیباچے میں شاعری کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ فاضلانہ، حکیمانہ، نیکو
طبعانہ، عاشقانہ اور شاعرانہ۔ فاضلانہ وہ ہے جس میں صنعتِ لفظی کا بھی کھل
کر استعمال کیا گیا ہو اور فارسی میں عربی کی (غیر مانوس اور غیر متناسب) آمیزش
کی گئی ہو۔ حکیمانہ یعنی وہ جسے سنائی، ناصر خسرو وغیرہ نے برتا اور سعدی کے
"در دنگ سود تق از ... رند" نیکو طبعانہ طرز کی شاعری غزلوں میں
سب ملی ہے یہ اچھا ہے کہ بیچ گرہ یا بعض غزلہا ی تریدآید و مصاسا ... و
اراں تو اند گر شتت۔ عاشقانہ وہ جس میں رنج، علامات، سوزش و شورش
ہو۔ شاعرانہ وہ جس میں جملہ طرزوں کا معتدلانہ امتزاج پایا جاتا ہو۔

باشی جو تعلیم ... مباد تاعر ناشی ولی نہ استاد
کیا یہی مقامات ہر دور میں نہیں کیا گیا؟ کیا ہمارے دور میں جدید شعراء و ناقدین ابھی
میاں کی تعاصی کو لے کر اپنی معیار کی عمارت نہیں اٹھا رہے ہیں۔؟

خسرو اپنی حقیقت پسندی کے باعث ہمارے اور قریب آجاتے ہیں
اپنی مثنویوں میں وہ جس واقعات نگاری، منظر کشی اور جاگ نگاری کی مثالیں
پیش کرتے ہیں اس کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے تجربے کے عینی اور معروضی مگر
حساس شاہد بن جاتے ہیں۔ یہی رویہ ہے جسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے
شاعری کے لئے تجویز کیا کہ شاعر کی شخصیت اس کے شعری اور تخلیقی تجربے میں ملوث
نہ ہو بلکہ محض CATALYTIC AGENT کی حیثیت رکھے۔

"اعجازِ خسروی" میں اسالیب کا ذکر آج کے معلمین اور ... کے لئے بہت
اہم ثابت ہو سکتا ہے۔ علمائے محقق کا اسلوب، داستان نگاروں کا اسلوب
مصلحا کا اسلوب، منشیوں کا اسلوب، مدرسوں کا اسلوب، عوام کا اسلوب، اہلِ
حرفہ (کرحداروں) کا اسلوب اور مزاح نگاروں، مسخروں اور نقالوں کا
اسلوب۔ ان تمام اسالیب میں قابل مذمت ٹھہرایا ہے۔ مدرسوں کا اسلوب
اور آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شاعری میں بھی خسرو "استادی" کے قائل نہیں۔
ان گزارشات سے مقصود یہ ہے کہ آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ امیر خسرو
محض شاعر یا وقائع نویس نہیں ہیں بلکہ باشعور اور صاحبِ علم متکلم جمالیات
(شعریات بھی ہیں)۔

امیر خسرو کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ جس تالاب میں
بھی رہے کنول کی طرح رہے۔ بیشتر مقامات پر انھوں نے آنکھیں اور کان کھلے رکھے
مگر زبان و لب کو جنبش نہ دی۔ وہ معروضی حقیقت کا مثالی کردار ہیں۔ ان کی عربی
میں روز بروز عبارتیں وہ ہیں جن میں ان کی اپنی دھرتی کا حسن، رنگ، دلاویز
مایہ و نور موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق غالب اور رائج طبقے سے تھا لیکن
ان کا شعری اور فکری رویہ کسی احساس برتری اور عصبیت کی مدافعت نہیں رکھتا

حسن الدین احمد

خسرویات

جب کسی ادیب یا شاعر کے فن، فکری حیاں اور اس کی قائم کی ہوئی راہوں اور روایات پر مختلف انداز سے اور مختلف پہلوؤں سے لکھا جاتا ہے اور معنی کی جاتی ہیں تب یہ سب ذخیرہ ایک باضابطہ علم کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ ہمارے ملک میں قریبی زمانہ میں دو عظیم شاعروں غالب اور اقبال کے متعلق سے سب کچھ لکھا گیا۔ ان تمام تحریرات کو علی الترتیب "غالبیات" اور "اقبالیات" کا نام دیا جاتا ہے "غالبیات" میں غالب کے کلام پر تبصروں اور تحقیقی تحقیقوں کے علاوہ غالب نے اپنی شاعری میں جو روایات قائم کیں، عام روش کے خلاف جو بغاوت کی اور حیات وکائنات کا جو مخصوص تصور پیش کیا ان سب کو شامل کیا جاتا ہے اسی طرح "اقبالیات" میں اقبال کے کلام پر تبصروں اور ان کے فلسفہ اور پیام کی تشریحات و توضیحات کو شریک کیا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے "خسرویات" حضرت امیر خسرو دہلوی کی عظیم شاعرانہ صلاحیتوں، ان کی جامع الکمال زندگی سے ان کے گوناگوں تجربوں اور ان کی فکر و نظر کی وسعت سے متعلق ساری تحقیقوں کے مجموعہ کو سمجھا جانا چاہئے۔ لیکن جب ہم اس افسوسناک حقیقت پر نظر کرتے ہیں کہ عوام میں اس بلند پایہ مصنف کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود ادبی اور علمی حیثیت سے اس بارے میں گزشتہ سات سو سال کے عرصہ میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے تو نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ ایک بڑی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن وقت نے حضرت امیر خسرو کے نام کے مقابلہ میں ہار مان لی ہے۔ امتداد زمانہ سے ان کے کلام کا بڑا حصہ ضائع تو ہوا لیکن ان کا مجموعی تاثر اور پیغام آج بھی اہل ادب کے لئے شمع ہدایت ہے اور سات سو سال کے بعد پہلی دفعہ ان کی باضابطہ طور پر عالمگیر پیمانہ پر پذیرائی جا رہی ہے۔ ایک سے زیادہ ملکوں کی جانب سے ان کی خدمت میں خراج ہائے عقیدت پیش کئے جا رہے ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ "خسرویات" کو ایک سوچے ہوئے منصوبہ کے تحت اور علم کی حیثیت سے ترقی دی جائے اور اس کی ابتدا کی پوری طرح وضاحت کیا جائے۔

آج "خسرویات" کی اس لئے ضرورت ہے کہ آج سے پہلے اس طرف کم دھیان دیا گیا۔ "خسرویات" کی اس لئے ضرورت ہے کہ آج دنیا کو ریسرچ کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے خسرو کا جانب کس پیام ناگزیر ہے جو پیام جو انسان دوستی سچائی پیار اور محبت و اخوت کا پیام ہے آج بھی خسرو کی اختیار کی ہوئی راہیں دانشوروں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔ "خسرویات" کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کی تصانیف میں علم و دانش اور ادبی شاہکاروں کا ایک عظیم خزانہ محققین و جستجو کی نظروں سے بڑی حد تک اوجھل رہا ہے۔ اس بارے میں احتمالی امور کی حد تک باقاعدہ جانچ پڑتال کی ضرورت ہے تاکہ بحث و مباحثہ کے بعد کسی معقول نتیجہ کو سامنے لایا جا سکے۔

ہندوستان کی ثقافتی تاریخ میں نواب عماد الملک (۱۸۴۴ء تا ۱۹۲۵ء) کے دور کو علمی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے زرین دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کا شمار حیدرآباد کی ایسی شخصیتوں میں کیا جا سکتا ہے جن کی بلند پایہ علمی خدمات اور تعلیمی کارناموں پر دکن ہی نہیں سارا ہندوستان بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ اگر اس دور میں دائرۃ المعارف کا قیام عمل میں آیا (۱۸۸۸ء) جس کی جانب سے سینکڑوں عربی اور فارسی مخطوطات کی اشاعت عمل میں آئی۔ کتب خانہ آصفیہ قائم کیا گیا جہاں ملک بھر میں السنہ مشرقی کا اہم اور بیش قیمت ذخیرہ ہے، جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی جہاں اسی نوعیت کا ایک انوکھا منفرد اور تاریخی تجربہ کیا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ نواب عماد الملک کی دور رس نگاہوں نے آج سے ٹھیک ۶۲ سال قبل ہی خسرویات کی ضرورت اور اہمیت کو حیدرآباد میں محسوس فرمایا اور مئی ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ سے متعلق نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے فرزند نواب اسحاق خان صاحب سے (جب کہ وہ نواب وقار الملک کے بعد علی گڑھ کے آنریری سکریٹری تھے) جو مراسلت ہوئی تھی اس میں ارشاد فرمایا کہ:

"بہت وثوق کے ساتھ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا جس کی تصنیفات اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو، لہذا اگر آپ کی کوشش سے مشہور زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم، نثر جو جملہ اصناف سخن میں بزبان فارسی ہندی اور جس قدر موجود ہو یا پایا ن کیا جاتا ہے جمع ہو کر چھپ گیا تو یہی قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نتیجہ محدود ہوگا، جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی اور مجھے یقین ہے کہ یورپ میں خصوصیات کے ساتھ امیر خسرو کی بہت مانگ ہوگی اور تمام لوگ ہاتھوں ہاتھ ٹھکانے لگ جائیں گے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔ ہاں جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے فوراً ایک ہزار روپیہ اس وقت دیتا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار اور دوں گا۔

اس کے بعد نواب اسحاق خاں صاحب بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار روپے، سرکار عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سر سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خاں صاحب (فضیلت جنگ) سے پانچ سو کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اس تحریک کو حقیقی معنوں میں دور خسرویات کی بنیاد کہا جا سکتا ہے اس تحریک اور بروقت مالی امداد پر نواب اسحاق خاں صاحب نے اس دشوار کام کی ذمہ داری قبول کر لی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو اپنی رپورٹ پیش فرما دی۔ اسی رپورٹ کے نتیجے کے طور پر ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۷ء کے دوران علی گڑھ سے امیر خسرو کی حسب ذیل کتابوں کی اشاعت کا کام ہوا۔

نام تصنیف	نام مرتب	سال اشاعت
۱۔ آئینہ سکندری	سعید احمد فاروقی	۱۹۱۷ء
۲۔ دول رانی خضر خاں	رشید احمد سالم	۱۹۱۷ء
۳۔ مجنوں لیلیٰ	حبیب الرحمٰن شیروانی	۱۹۱۷ء
۴۔ ہشت بہشت	سلیمان اشرف	۱۹۱۸ء
۵۔ قران السعدین	ایم۔ اسماعیل	۱۹۱۸ء
۶۔ جواہر خسروی	ایم ایس چریا کوٹی	۱۹۱۸ء
۷۔ دیوان وسط الحیات	فضل احمد حافظ	۱۹۲ء
۸۔ مطلع الانوار	مقتدیٰ خاں شیروانی	۱۹۲۶ء
۹۔ شیریں خسرو	علی احمد اسیر	۱۹۲۷ء

اس طرح ۱۹۱۴ء میں نہ صرف شعوری طور پر خسرویات کی بنیاد رکھی گئی بلکہ امیر خسرو کی تمام تصانیف کو حاصل کرنے اور طباعت کے ذریعہ محفوظ کرنے کا مبارک اور مستحسن اقدام کیا گیا۔

امیر خسرو کا ذکر میر خورد نے کیا ہے جو امیر خسرو کے ہم عصر تھے۔ جامی نے ان کی تصانیف کی تعداد ۹۲ ظاہر کی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے اپنی تصانیف کی حفاظت کا کافی اہتمام کیا تھا۔ وہ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جن کا شہرہ ان کی زندگی ہی میں دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتابوں کے نسخے کتابت کروا کر تقسیم کئے تھے جن کی مانگ بڑھتی گئی۔ اور نقلیں دور دور تک پھیل گئیں۔ خود حافظ شیرازی نے ان کی بعض تصانیف کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ تاشقند کے علوم مشرقیہ کے انسٹی ٹیوٹ موسومہ البیرونی میں حافظ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تین مثنویاں شیریں خسرو، ہشت بہشت اور آئینہ سکندری موجود ہیں۔ پھر بھی سات سو سال کا عرصہ کافی طویل ہوتا ہے۔ کتابت کے ذریعہ محدود تعداد ہی میں اشاعت ہو سکتی ہے انقلابات زمانہ کے باعث اور خصوصاً مغلیہ

سلطنت کے زوال کے بعد کتابوں کا پتہ لگانا کہ کہاں کہاں ہیں اور تمام کتابیں ہیں بھی یا نہیں مشکل مسئلہ ہو گیا فارسی دانی میں کمی کی وجہ سے یہ مشکل بڑھ گئی۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں اگر ان تمام معلومات کو اکٹھا کرنے کی قابل قدر کوشش نہ کی جاتی اور تصانیف کا احاطہ کرنے کا مستحسن اقدام نہ کیا جاتا تو آج خسرویات پر کام کرنا مشکل بلکہ قریب قریب ناکام ہو جاتا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۷ء کے درمیان مختصر سی مدت میں خسرویات پر جو بنیادی کام ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اس کام سے جو لوگ وابستہ رہے وہ بلند پایہ عالم تھے اور انہوں نے نہایت محنت سے اپنے اس کام کو انجام دیا۔ نہ ایسا شاندار کام ۱۹۱۴ء سے پہلے کبھی ہوا نہ ۱۹۲۷ء سے آج تک ہوا۔ البتہ ۱۹۱۴ء سے قبل کے سناٹے کے مقابلہ میں ۱۹۲۷ء کے بعد وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ کام ہوتے رہے۔ چنانچہ جہاں تک امیر خسرو کی تصانیف کا تعلق ہے حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

نام تصنیف	نام مرتب	مقام وسال اشاعت	
۱۔ تغلق نامہ	ہاشمی فرید آبادی	حیدرآباد	۱۹۳۳ء
۲۔ نہ سپہر	ڈاکٹر وحید مرزا	کلکتہ	۱۹۴۸ء
۳۔ خزائن الفتوح	"	"	۱۹۵۳ء
۴۔ لیلیٰ مجنوں	طاہر احمد محرم اوف	ماسکو	۱۹۶۵ء
۵۔ ہشت بہشت	ج انصاری جعفر علیف	"	۱۹۷۲ء

ان کے علاوہ حسب ذیل کتب بعد تصحیح ومقابلہ تیار ہو چکی ہیں اور اشاعت کے لئے تیار ہیں۔

نام تصنیف	نام مرتب	مقام
۱۔ بقیہ نقیہ	سید حسال شاہ القادری	کلکتہ
۲۔ تحفۃ الصغر	"	"
۳۔ غرۃ الکمال	ڈاکٹر غلام دستگیر رشید	حیدرآباد
۴۔ اعجاز خسروی	سنٹر آف اڈوانس اسٹڈیز	علی گڑھ

ان بیٹری

حضرت امیر خسرو پر جو قابل لحاظ کام ہوتے ہیں ان میں ڈاکٹر اسپرنگر کے مقالہ کو شامل کیا جا سکتا ہے جو جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بھی خسرو کے کلام کا ذکر دلکش انداز میں کیا ہے۔ منشی سید احمد مارہروی کی حیات خسرو (۱۹۰۹ء) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ مولانا شبلی کی حیات خسرو بھی بیش بہا معلوماتی کتاب ہے۔ پروفیسر محمد حبیب کا انگریزی مقالہ بھی علمی انداز کا حامل اور قابل قدر کام ہے۔ ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر وحید مرزا نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اپنا مقالہ امیر خسرو: زندگی اور کام لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ نہایت جامع کتاب ہے ڈاکٹر وحید مرزا کا کام خسرویات میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے کا مستحق ہے۔ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں اور حفظ اللسان معروف بہ خالق باری میں خالق باری کو ضیاء الدین خسرو کی تصنیف قرار دے کر خسرویات میں اہم بحث چھیڑ دی ہے۔ علی عباس حسینی صاحب نے امیر خسرو نامی قلمی ڈھنگ کی ایک کہانی لکھی

ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ کی کتاب امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر میں اہم مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ علامہ سامانی نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کو پٹیسل بک ٹرسٹ نے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پر از معلومات ہے۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری از ڈاکٹر سخاوت علی سندیلوی ایک مفید کام ہے۔ ادارہ تعلیم ترقی مکتبہ جامعہ نے ایک مختصر رسالہ امیر خسرو کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے شائع کیا ہے۔ ہندوستان ٹائمز کی نظر میں صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا علمی مقالہ ہے جس میں بڑی محنت سے بیشتر مواد جمع کیا گیا ہے اور امیر خسرو کے کلام کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر تارا چند کا ایک مضمون کتابچہ کی شکل میں امیر خسرو اکیڈمی سے شائع ہوا ہے "انڈو ایرانیکا" کے امیر خسرو نمبر (۱۹۷۰ء) میں امیر خسرو پر آٹھ نہایت پر از معلومات مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف رسالوں میں علمی اور تحقیقاتی مضامین شائع ہوتے ہیں ضرورت ہے کہ ان کی تفصیلی فہرست شائع کی جائے۔

روس میں بھی خسرویات پر کام ہوا ہے۔ خمسہ کی پانچوں مثنویوں کی ایڈیٹنگ کا کام ہوا ہے جس سے ہندوستان کے اسکالر ڈاکٹر ظ۔ انصاری بحیثیت ایڈیٹر وابستہ رہے ہیں۔ ایران سے انتخاب کلام امیر خسرو نہایت آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔

یہ سب کوششیں جو اس وقت تک ہوئی ہیں اس ضرورت کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں جو خسرویات کے متعلق سے محسوس کی جاتی ہے۔

خسرویات کے سلسلہ میں جو کام ہونے ضروری ہیں ان میں امیر خسرو کی ان کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دی جانی چاہئے جو اس وقت شائع نہیں ہوئی ہیں ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور سب کی ایڈیٹنگ ہو چکی ہے یعنی بقیہ غرۃ الکمال، تحفۃ الصغر اور اعجاز خسروی۔ یہ کام قومی کمیٹی کے پیش نظر ہے۔

ان کے علاوہ جو کتابیں قبل از یں شائع ہو چکی ہیں لیکن دستیاب نہیں ہوتیں ان کی مکرر اشاعت کی ضرورت ہے اس پراجکٹ کو بھی قومی کمیٹی نے منظور کیا ہے۔

جو کتابیں امیر خسرو کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان میں سے بعض ان کی نہیں ہیں مثلاً ڈاکٹر وحید مرزا نے مدلل ثابت کیا ہے کہ چہار درویش، انشائے خسروی، قصہ امیر خسرو مشتمل بہ داستان، ماہنامہ امیر خسرو کی تصانیف نہیں ہیں۔ اسی طرح خسرو کے ہندی کلام پر شک کیا جاتا ہے۔ مخطوطات کی عدم موجودگی میں یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ جو ہندی کلام امیر خسرو سے موسوم ہے اس میں کتنا کلام ان کا ہے اور کتنا الحاقی۔ اس سلسلے میں اندرونی شواہد سے مدد لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب امیر خسرو نے ہندی میں بھی شاعری کی ہے۔ اور صراحت سے اس کا ذکر کیا ہے تو پھر ان کا ہندی کلام کہاں ضائع ہوا اور مخطوطات کی شکل میں کیوں ہم تک نہیں پہنچا خسرویات کے سلسلے میں ان تمام سوالات کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور اس بات کا تعین بھی ضروری ہے کہ کونسی کتابیں امیر خسرو کی ہیں اور کون سی نہیں۔

قوال ستار وغیرہ کو بھی عام طور پر امیر خسرو کی ایجاد و اختراع خیال کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں بھی قطعی شواہد کی عدم موجودگی میں بعض گوشوں سے اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں رسالہ نقوش لاہور اکتوبر، نومبر ۱۹۶۴ء میں رشید ملک نے ایک دلچسپ اور پر از معلومات مقالہ موسیقی اور امیر خسرو لکھا ہے۔ اور طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قوالی اور ستار امیر خسرو سے پہلے کی چیزیں ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس سلسلے میں تحقیق کر کے ان اختلافی مباحث کا حل تلاش کیا جائے۔

امیر خسرو کے کلام میں بعض الفاظ اصطلاحات، تراکیب، استعارے، ہندو ملبوسات، لباس، سامان آرائش کے نام استعمال ہوتے ہیں جو امیر خسرو کے زمانہ میں مستعمل تھے۔ یہ یا تو متروک ہو گئے ہیں یا ان کا تلفظ اور معنی بدل گئے ہیں۔ ایسی فرہنگ کی ضرورت ہے جو ان تمام الفاظ پر حاوی ہو۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری فرہنگ تیار کر رہے ہیں۔ ان تشریحات کی مدد سے معلوم ہو سکے گا کہ پہلے تک کی فارسی ادبیات کی مشکلات حل کی جا سکیں گی۔

حضرت امیر خسرو نے چونکہ بادشاہوں کے دربار میں رہ کر شاعری کی اس لئے ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر واقعہ نگاری بھی ملتی ہے۔ بقول مولانا شبلی قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی نامدیوں کے ساتھ تاریخی حیثیت تمام محفوظ رکھی گئی ہیں۔ اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا۔ یہی حال دول رانی، خضر خاں، خزائن الفتوح، مفتاح الفتوح کا بھی ہے۔ دنیا کے کسی اور ادب میں یہ خصوصیت شاید ہی ملے گی کہ شاعری تاریخ کا اتنا اہم ماخذ قرار پاتی۔

اس سلسلے میں ان کے کلام کا ایسا استفادہ نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کا حق تھا۔ اب ضرورت ہے کہ ان کے کلام کا تاریخی ترجمہ اور علمی تجزیہ کیا جائے اور اس مواد پر تحقیقی نظر ڈالی جائے۔ ایسا کرنے سے تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آنے کا امکان ہے۔

امیر خسرو بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں لیکن ان کا کلام وسیع خطہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو ایک سے زیادہ ملکوں پر مشتمل ہے۔ ایران، روس کے علاقوں، افغانستان اور ایران میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس لئے خسرویات کی صرف قومی نہیں بین الاقوامی اہمیت بھی ہے۔ اور اس کو اہم محراب کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

خسرویات کے ذریعہ ہم ایک بڑے خطے کے طرز عمل کو تشکیل دے سکتے ہیں اور خسرو کے پیام کو عام کر سکتے ہیں اور اس سے دنیا کی بھلائی کے لئے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو کی فارسی تصانیف اب تک معلوم ہو سکی ہیں ان کی تعداد (۱۸) ہے[1]
ان کے فارسی کلام کا مجموعہ باعتبار ترتیب زمانی پانچ حصوں میں ہے:

۱۔ تحفۃ الصغر (۶۶۹ھ) جس میں (۱۹) برس کی عمر تک کہا ہوا کلام شامل ہے
۲۔ وسط الحیات (۶۸۲ھ) اس میں ۳۲ سال کی عمر تک کی شعری تخلیقات ہیں
۳۔ غرۃ الکمال (۶۹۲ھ) اس میں ۴۲ سال کی عمر تک کہا ہوا کلام ہے۔ اس کے طویل دیباچے سے امیر خسرو کی سوانح حیات کے کچھ اشارے بھی ملتے ہیں۔
۴۔ بقیہ نقیہ (۷۱۴ھ)
۵۔ نہایۃ الکمال (۷۲۵ھ)

ان کے علاوہ امیر خسرو کی ۹ مثنویاں ملتی ہیں جو سب چھپ چکی ہیں۔

۱۔ قران السعدین[2] (۶۸۸ھ)
۲۔ پنج گنج (در جواب خمسۂ نظامی) اس میں یہ پانچ مثنویاں ہیں۔
(۱) مطلع الانوار (۲) شیریں خسرو (۳) لیلیٰ مجنوں (۴) آئینۂ سکندری (۵) ہشت بہشت
۳۔ نہ سپہر (۷۱۸ھ) یہ قطب الدین مبارک شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ وحید مرزا نے اسے ایڈٹ کر کے چھاپ دیا ہے[3]
۴۔ دول رانی خضر خاں (۷۱۵ھ) اس کا نام عشقیہ، عشقہ، آغاز عشق اور شا سور نامہ بھی ہے۔
۵۔ تغلق نامہ[4] (۷۲۵ھ)

فارسی نثر میں ان سے چار کتابیں منسوب ہیں۔

(۱) خزائن الفتوح یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ سے چھپ چکی ہے اسے ڈاکٹر سید معین الحق نے ایڈٹ کیا تھا اور پروفیسر محمد حبیب نے مقدمہ لکھا تھا۔
(۲) اعجاز خسروی۔ اس کا دوسرا نام رسائل الاعجاز بھی ہے اور بعض کتب خانوں کی فہرست میں منشآت امیر خسرو کے نام سے درج ہوئی ہے۔
۳۔ افضل الفوائد - ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ دونوں چھپ چکے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب میں تصانیف امیر خسرو کا تفصیلی جائزہ موجود ہے انھوں نے تصانیف کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف (۱۸) کتابوں کے نام درج کر رہے ہیں تفصیلی بحث اس مضمون کے دائرے سے خارج ہے اسی طرح وحید مرزا نے امیر خسرو کی تصانیف کی ترتیب کا جو زمانہ متعین کیا ہے اس سے متعدد مواقع پر راقم الحروف کو اختلاف ہے اس سلسلہ کی بحث کسی دوسرے مضمون میں پیش ہوگی

[2] قران السعدین میں کیقباد اور اس کے باپ بغرا خاں کی ملاقات کا حال ہے تاریخی حیثیت سے اہم ہے اس کی شرح مولوی عبدالحق حقانی دہلوی (مفسر قرآن) متوفی ۱۳۴۲ھ کے فرزند مولوی [illegible] متوفی ۱۳۶۲ھ نے نور العینین فی شرح قران السعدین کے نام سے کی تھی اس کا ابھی تک امیر خسرو کے کسی مصنف نے تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں ہے [illegible] کا لکھا ہوا ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں ملتا ہے [illegible] کا لکھا ہوا [illegible] ہیں اور چوتھا انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب خانے میں ہے۔

PUBLISHED FOR THE ISLAMIC RESEARCH ASSOCIATOIN BY GEOFFREY CUMBERLEGE, OXFORD UNIVERSITY PRESS 1950

[3] اس کا ایک بہت نفیس اور خوشخط قلمی نسخہ [illegible] کے کتب خانے میں رہ چکا ہے نیشنل میوزیم نئی دہلی میں محفوظ ہے اسے [illegible] میں میر علی نے لکھا تھا۔ دیکھئے (No L 53 2/7)

[4] امیر خسرو کی تصانیف میں سب سے کمیاب یہی ہے اب تک اس کا صرف ایک نسخہ ملا ہے جو کہ حاجی حبیب گنج (علی گڑھ) میں ہے پروفیسر محمد حبیب کا خیال ہے کہ اسے مغلوں کے زمانے میں عمداً ضائع کیا گیا ہوگا۔ فرشتہ نے بھی اپنے زمانے میں اس کے کمیاب ہونے کی شکایت کی ہے اب یہ حیدرآباد دکن سے چھپ چکا ہے (۱۹۳۳ء)

۴۔ راحت المحبین: اس کے نسخے بھی مل جاتے ہیں۔ راحت المحبین کے قلمی نسخے کم ملتے ہیں۔ افضل الفوائد کے قلمی نسخے پٹنہ[1]، اعظم گڑھ، ٹونک، مسلم یونیورسٹی اور علی گڑھ میں موجود ہیں۔ اس مضمون میں انہیں دونوں کتابوں کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

ان کے علاوہ ایک مسمط قاف کا مجموعہ لالی معانی معروف بہ جواہر خسروی کے نام سے چھپا تھا (۱۹۱۰ء) جس میں ان کا ہندوی کلام اور نصاب بدیع، خالق باری وغیرہ شامل ہیں مگر ان سب کا اعتبار مشتبہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے خالق باری کا تحلیلی مطالعہ کر کے ثابت کیا ہے کہ عہد جہانگیری کے ایک شاعر ضیاء الدین خسرو شاہ کی تصنیف ہے۔ امیر خسرو سے منسوب ہندی کلام اور پہیلیوں وغیرہ کی بھی کوئی قدیم سند نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ بعض اور کتابوں کا انتساب بھی امیر خسرو سے ہوا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ "قصہ چہار درویش" فارسی ان کی تصنیف ہے[3]۔ اور بعض نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے زمانے میں یہ داستان انہیں سنائی تھی۔ ہم نے یہاں مشکوک یا غیر مستند تصانیف کو شمار نہیں کیا ہے۔

(۲)

سردست ہمیں صرف آخری دو کتابوں کا جائزہ لینا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء (وصال ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) کے ملفوظات دو جلدوں میں فراہم کیے تھے۔ پہلی جلد کا نام افضل الفوائد اور دوسری کا راحت المحبین ہے[4]۔ ملفوظات صوفیا کے بعض اور مجموعوں کی طرح ان دونوں کتابوں کا بھی تصنیف امیر خسرو ہونا مشتبہ سمجھا گیا ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب[5] میں ان کا کہیں نام تک نہیں لیا لیکن وحید مرزا نے افضل الفوائد کو امیر خسرو کی تالیف مانا ہے[6] اور جا بجا اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس وقت پروفیسر محمد حبیب ان کتابوں کے وجود سے بے خبر تھے ورنہ انہوں نے راحت المحبین کو بھی ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ بعد کو انہوں نے خواجگان چشت کے ملفوظات کا تنقیدی مطالعہ کیا[7] تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ان میں سے بیشتر جعلی ہیں۔ راحت القلوب، فوائد السالکین اور اسرار الاولیاء کا ایک تنقیدی جائزہ راقم الحروف نے بھی رسالہ منادی، دہلی کے بابا فرید نمبر (۱۹۷۴ء) میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب نے ان ملفوظات کے جعلی ہونے کی جو دلیلیں دی ہیں ان سے جناب صباح الدین عبد الرحمن کو اختلاف ہے[8]۔ اگرچہ وہ ان ملفوظات کی حمایت میں قوی تر دلائل فراہم نہیں کر سکے ہیں۔

ان ملفوظات کو جعلی قرار دینے کے سلسلے میں جو خارجی شواہد پیش کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی (وصال ۷۵۷ھ) نے ایک مجلس میں فرمایا کہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء اور ہمارے شجرے کے دوسرے مشائخ میں سے کسی نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے۔ اس پر حمید قلندر جامع خیر المجالس نے بطور تائید کہا کہ فوائد الفواد میں ہے[9] کہ کسی شخص نے حضرت نظام الدین سے عرض کیا کہ اودھ میں مجھے ایک شخص نے ایک کتاب دکھائی تھی اور کہا تھا کہ یہ آپ کی تصنیف ہے۔ حضرت نظام الدین نے فرمایا کہ "اس نے غلط کہا۔ میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے"۔ پھر حمید قلندر نے پوچھا کہ یہ جو ملفوظات ملتے ہیں کیا اس زمانے میں نہ تھے؟ حضرت چراغ دہلی نے فرمایا "نہیں۔ اگر ہوتے تو حضرت شیخ ان کا تذکرہ کرتے اور یہ دستیاب ہوتے"۔

حضرت چراغ دہلی نے یہ بھی فرمایا کہ ان ملفوظات میں بہتیری باتیں ایسی ملتی ہیں جو ان بزرگوں کے شایان شان نہیں ہیں[10]۔

۲۔ ہندوستان میں چشتی سلسلے کی دو مستند کتابیں فوائد الفواد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء فراہم کردہ امیر حسن علا سجزی دہلوی) اور سیر الاولیاء مصنفہ سید محمد میر خورد کرمانی[11] میں ان ملفوظات کے مجموعوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ حالانکہ مصنف سیر الاولیاء نے تا مقدور تمام کتب سے استفادہ کیا ہے۔ اور اسے خاص طور پر ان کتابوں سے باخبر ہونے اور ان تک دسترس حاصل کرنے کے مواقع خوب حاصل تھے۔

۳۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ اور جانشین حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مجلس میں ایک بار ان ملفوظات کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت

---

[1] مرآۃ العلوم جلد ۳/ ۲۱۰ [2] فہرست مخطوطات دار العلوم دیوبند جلد ۲/ ۳۶ و ۲/ ۳، [3] میر امن دہلوی، باغ و بہار (دیباچہ) [4] یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ ہشت بہشت نامی مجموعے میں شامل ہے، اللہ والے کی قومی دکان، لاہور ۱۹۵۶ء) اور اس وقت یہی میرے سامنے ہے۔

[5] MOHAMMAD HABIB: HAZRAT AMIR KHUSRAU OF DELHI, (ALIGARH UNIVERSITY PABLICATION, 1927)

[6] WAHID MIRZA (MOHAMMAD): THE LIFE & WORKS OF AMIR KHUSRAU, (PANJAB UNIVERSITY PABLICATION, 1935)

[7] MOHAMMAD HABIB CHISHTI MYSTIC RECORD OF THE SALTANATE PERIOD, 'MEDIEVAL INDIA' QUARTERLY, VOL 1, 11, (1950)

[8] خیر المجالس (مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی) ۵۲-۵۳
[9] فوائد الفواد (مرتبہ لطیف ملک) ۶، [10] خیر المجالس ۵۲
[11] شائع کردہ چرنجی لال۔ مطبع محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء ص۳
[12] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۸ ب

نظام الدین کے جو ملفوظات امیر حسن شاعر نے جمع کئے ہیں وہ معتبر ہیں، باقی جن لوگوں نے ج کے ملفوظات لکھے ہیں ہمہ برباد ہوا ست۔[1] انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اودھ میں ... الدین کے ملفوظات کا ایک مجموعہ دیکھا تھا جسے سید صدر الدین اسحاق سے کچھ ... منسوب سمجھا۔ ایک واقعہ سنایا کہ مولانا محمد بانی خواہر زادہ صدر الدین اسحاق کے مرید تھے[2] انھوں نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات جمع کئے تھے اور ایک بڑی جلد ہو گئی تھی۔ جب حضرت چراغ دہلی ٹھٹھہ (سندھ) سے واپس آئے تو مولانا محمد وہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت چراغ دہلی نے اپنے بھانجے سید زین العابدین کو بلایا اور کہا ایک تغار لاؤ۔ وہ لے آئے تو فرمایا اسے پانی سے بھر دو۔ بھر لیا تو کہا اس کتاب کو پھاڑ کر اس میں دھو ڈالو چنانچہ ان کے سامنے اسے دھلوا دیا۔

جوامع الکلم میں یہ بھی ہے[3] کہ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ مولانا کمال الدین ... کو ان ملفوظات کے دکھانے جو حمید قلندر نے فراہم کئے تھے (یہ خیر المجالس کی طرف اشارہ ہے) حضرت نے فرمایا کہ من چیزے دیگر گفتہ ام و مولانا حمید الدین چیزے دیگر نوشتہ است، اور ان اوراق کو لے کر پھینک دیا۔ لیکن خیر المجالس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حمید قلندر نے ان ملفوظات کی صحت کے لئے سب اہتمام کیا تھا اور اسے دوران تالیف میں حضرت چراغ دہلی کے ملاحظہ کے لئے پیش کرتے رہتے تھے۔[4]

فوائد الفواد کے حسن ترتیب، صحت اور جامعیت کو ملفوظات کا دوسرا کوئی مجموعہ نہیں پہنچتا۔ امیر حسن علاء سنجری نے بارہ سال میں (۱۸۸) مجلسوں کے ملفوظات بڑے اہتمام سے جمع کئے۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے دست مبارک سے ان کی تصحیح کی تھی[5] اس میں کہیں فوائد السالکین، راحت القلوب یا اسرار الاولیاء وغیرہ کتابوں کا نام تک نہیں آیا جس زمانہ میں فوائد الفواد مرتب ہو رہی تھی اس عہد کے ملفوظات دُرر نظامیہ میں بھی ملتے ہیں[6] اور دونوں میں امیر خسرو کی افضل الفوائد یا راحت المحبین کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ امیر خسرو بھی تقریباً وہی نا مختلف درج کی ... امیر حسن دہلوی امیر خسرو کے گہرے دوست تھے اتنے کہ دونوں کی محبت کے افسانے مشہور ہو گئے ہیں مگر فوائد الفواد میں امیر خسرو کا نام صرف ایک جگہ ضمناً آیا ہے۔[7] ورنہ وہ حاضرین مجلس کے درمیان کہیں نظر نہیں آتے۔ اسی طرح افضل الفوائد میں حسن علاء سنجری صرف دو جگہ ملتے ہیں۔[8]

حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل کئی مجموعے فراہم کئے گئے۔ فوائد الفواد کے علاوہ ایک مجموعہ انوار المجالس سید محمد امام بن خواجہ بدر الدین اسحاق دہلوی نے مرتب کیا تھا۔[9] میر عزیز الدین صوفی نے تحفۃ الابرار وکرامۃ الاخیار ترتیب دیا تھا جسے بھی حضرت نظام الدین نے ملاحظہ فرما کر تصحیح کی تھی۔ چوتھا مجموعہ حضرت کے خادم ابو بکر مصلی بردار کے فرزند ... نے تیار کیا تھا۔[10] اور اس کا نام مجموع الفوائد رکھا تھا۔ پانچویں کتاب ملفوظات المشائخ تھی۔[11] جسے خواجہ شمس الدین دہلوی نے ترتیب دیا تھا۔ عربی زبان میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ایک تالیف خلاصۃ اللطائف مولانا علی بن محمود جاندار نے لکھی تھی[12] جس کا ایک اقتباس سیر الاولیاء میں موجود ہے اور وہیں سے شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے۔[13] ساتواں مجموعہ دُرر نظامیہ ہے۔ اس کے مؤلف بھی یہی علی بن محمود جاندار ہیں اور صرف اسی کتاب کا قلمی نسخہ ملتا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) میں محفوظ ہے[14] اردو ترجمہ البتہ چھپ گیا ہے۔[15]

حضرت نظام الدین اولیاء کی ذات میں بقول حضرت بابا فرید گنج شکرؒ علم، عقل اور عشق تینوں جوہر جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے بہترین علما سے پڑھا تھا جن میں مولانا امین الدین محدث تبریزی[16] مولانا کمال الدین زاہد[17] مولانا علاء الدین اصولی[18] اور حضرت بابا فرید گنج شکر جیسی باکمال ہستیاں ہیں۔[19] اس وقت تک جو کتابیں تصوف، فقہ اور حدیث کی رائج تھیں وہ حضرت کے مطالعے

---

۵ ... اسرار الاولیاء کی طرف اشارہ ہے۔ اس کتاب کا بھی تنقیدی جائزہ بابا فرید نمبر میں شامل ہے۔ [1] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۸ ب [2] یہ مولانا سید محمد امام کی طرف اشارہ ہے۔ جو ... بدر الدین اسحٰق کے فرزند تھے۔ بستی نظام الدین اولیاء میں ان کا مزار ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے مورث اعلیٰ تھے۔ (حالات کے لئے ملاحظہ ہو سیر الاولیاء/ ۲-۲۱) انھوں نے ... حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات بھی انوار المجالس نامی کتاب میں جمع کئے تھے۔ اس کے کچھ اقتباسات سیر الاولیاء صفحہ ۲۰۹، ۲ میں آئے ہیں۔ ... ہوتا ہے کہ ایسے ہی بے تکلف اظہار کی وجہ سے اس مجموعے کو بعد میں نظر انداز کر دیا گیا ہوگا [3] ٹھٹھہ سے واپسی انتقال سے چھ سال قبل ہوئی تھی۔ [4] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۸ ب ۹ الف [5] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹ الف [6] خیر المجالس ص ۲۱۸ [7] خیر المجالس صفحہ ۲۱۸ [8] فوائد الفواد ۴۹ سیر الاولیاء/ ۳۰۸ ... دُرر نظامیہ کے بارے میں میرا ایک تفصیلی مضمون مناد ی کے بابا فرید نمبر میں شامل ہے [9] فوائد الفواد ۲۴۲ [10] افضل الفوائد (اردو ترجمہ) صفحات ۲-۵۷ ... سیر الاولیاء ۳۰۷ [11] سیر الاولیاء ۲۲ [12] سیر الاولیاء ۲۷ [13] سیر الاولیاء/ ۳۱۸ [14] سیر الاولیاء/ ۳۲۹ [15] اخبار الاخیار/ ۹۴-۹۵ ... میں خلاصۃ اللطائف کا جو اقتباس عربی میں ملتا ہے وہی دُرر نظامیہ باب ۱۲ صفحہ ۱۳۹ میں پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ خلاصۃ اللطائف میں ایک ... طالب عربی زبان میں بیان ہوں گے جو دُرر نظامیہ میں فارسی میں ہیں۔

[14] ... (نمبر ۱۸۲) [15] کتب خانہ نذیریہ، اردو بازار دہلی سے شائع [16] دُرر نظامیہ باب ۲۱ ص ۱۸۸ نیز فوائد الفواد ۲۴۳ [17] سیر الاولیاء ص ۱۰۱، اخبار الاخیار [18] فوائد الفواد ۲۷۸، ۳۴۰، ۳۴۱ وغیرہ خیر المجالس ۱۹۰، ۱۹۱ تذکرۃ الواصلین ۹ [19] بابا فرید سے انھوں نے عوارف المعارف کا درس لیا تھا فوائد الفواد/ ۴۳۔ اس کے علاوہ ملاقات اربعین تمہید ابو شکور سلمی کا ذکر بھی آیا ہے۔ سیر الاولیاء/ ۱۱۶

... سیر الاولیاء/ ۱۰۱

میں زیرک تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ بحّاث اور محفل شکن مشہور تھے۔[1] فوائد الفواد میں فقہ، حدیث، تفسیر، اخلاق، تصوّف اور سلوک کے جو نکتے بیان ہوئے ہیں اور دُررِ نظامیہ میں جو معارف ہیں انھیں دیکھ کر کسی کو بھی یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہو سکتی کہ حضرت نظام الدین اعلیٰ درجہ کا علمی ذوق رکھتے تھے اور ان کی مجلسوں میں بہترین علمی نکات بیان ہوتے تھے۔ غیاث الدین تغلق نے سماع کے موضوع پر جو مناظرہ اپنے دربار میں منعقد کرایا تھا[2] اس میں حضرت تنہا تھے مگر آپ نے تمام علماً کی زبان بند کر دی تھی۔ لیکن جعلی ملفوظات کے مجموعوں میں یا تو وہ روایات ہیں جنھیں اسرائیلیات کہا جاتا ہے یا قصص الانبیاء کے اقتباسات ہیں یا فوق الفطرت عناصر، غیر معمولی مجاہدات و کرامات اور مبالغہ آمیز فضائل کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اگر فوائد الفواد یا دُررِ نظامیہ کے مطالب کا موازنہ مثلاً افضل الفوائد اور راحت المحبین کے مندرجات سے کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے اور اس سے یہ شبہ قوی تر ہو جاتا ہے کہ یہ ملفوظات بعد میں دوسری کتابوں کو سامنے رکھ کر وضع کر لئے گئے ہیں۔ ضیاء الدین برنی نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ایسی کتابوں کی مانگ اس زمانے میں اچانک بڑھ گئی تھی۔[3]

وہ تمام ملفوظات جن پر جعلی ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر باہم مماثل بھی ہیں۔ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیاء، افضل الفوائد اور راحت المحبین ان سب کتابوں کی ساخت ایک ہی ہے۔ کسی میں بھی تاریخی تسلسل بتانے کا وہ اہتمام نہیں ہے جو فوائد الفواد میں پایا جاتا ہے۔ حاضرین بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے نہیں ملتے۔ بات جب اکثر بغیر کسی سیاق و سباق کے شروع ہوتی ہے اور اسی طرح اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ مختلف کتابوں کے حوالے ان سب ملفوظات میں بار بار آتے ہیں کہ "میں نے فلاں کتاب میں لکھا دیکھا ہے..." اس کے برعکس فوائد الفواد کا انداز ایک حقیقی ملفوظ کا ہے۔ اس کی مجلسوں میں زندگی کی جھلک اور موضوعات میں تنوع ہے اور اس کے مطالعے سے دل کو سرور اور دماغ کو نور حاصل ہوتا ہے۔

"جعلی ملفوظات" کی تاریخیں بھی اکثر غلط ہیں اور ان کا تطابق دوسرے مآخذ کی مدد سے نہیں ہوتا۔ اگر ان میں دئے ہوئے سنین پر بھروسہ کیا جائے تو کسی واقعے کی صحت بھی قابلِ اعتبار نہیں رہتی۔ مگر صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ان کے دفاع میں کہتے ہیں کہ سنین کا غلط ہونا کاتبوں کا تصرف ہے۔ اگر بعض کاتبین کی کرامات سمجھ کر ان سے صرفِ نظر کی جائے اور صرف مطالب پر نظر کی جائے تو گتھی حل ہو جاتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کاتبوں کو تاریخ و سال ہی سے کیا دشمنی تھی؟ ہم ایک دو مواقع پر تو یہ عذر قبول کر سکتے ہیں مگر یہاں تو "پنبہ کجا کجا نہم" والا معاملہ ہے۔

ان سب ملفوظات کا تجزیاتی تحلیلی مطالعہ کرنے کے بعد فی الحال میری رائے بھی یہی ہے کہ موجودہ صورت میں ان کی صحت مشکوک ہے اور لکھنے والے عوام کی عقیدت و محبت کو دیکھتے ہوئے بعض کتب فروشوں نے تصوف کی کچھ معتبر اور کچھ نامعتبر کتابوں کے اقتباسات کو زبانی روایات سے مخلوط کر کے انھیں وضع کیا ہے۔ یہ کچھ ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ سیکڑوں مصنفوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی ہے۔ جاحظ کی زندگی میں اس کے نام سے کتابیں لکھ کر بیچی جاتی تھیں۔ خواجہ فریدالدین عطار سے کتنی ہی کتابوں کا غلط انتساب ہوا ہے۔ دیوان بو علی شاہ قلندر، دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، دیوان خواجہ معین الدین اجمیری اور دیوان زیب النساء مخفی اس کی چند مثالیں ہیں۔

مذکورۂ بالا اسباب امیر خسرو کی افضل الفوائد اور راحت المحبین پر بھی اسی طرح وارد ہوتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا تذکرہ نہ تو خود امیر خسرو نے اپنی کسی دوسری تصنیف میں کیا ہے، نہ ان کا حوالہ فوائد الفواد، دُررِ نظامیہ، خیر المجالس، سیر الاولیاء، جوامع الکلم یا اخبار الاخیار جیسی قدیم تالیفات میں پایا جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ میں امیر خسرو سے منسوب ان دونوں کتابوں کے جعلی ہونے کا اعلان قطعیت کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ بعض شواہد ان کے حق میں بھی مل جاتے ہیں جن میں سب سے قوی شہادت یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریب ہانسوی (متوفی ۷۳۸ھ) کے مریدوں میں تین بھائی تھے۔ ایک خواجہ حماد کاشانی (متوفی ۷۶۱ھ) جنھوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات احسن الاقوال کے نام سے جمع کئے ہیں[4] اور اس کے علاوہ منافع المسلمین، اسرار الطریقۃ اور حصول الوصول بھی ان کی تصانیف ہیں۔ دوسرے بھائی خواجہ مجدالدین کاشانی تھے جنھوں نے غرائب الکرامات اور بقیۃ الغرائب نامی دو کتابوں میں حضرت برہان الدین غریب کے ملفوظات کو جمع کیا تھا۔[5] تیسرے بھائی خواجہ رکن الدین دبیر کاشانی نے ایک قابل قدر کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء[6] لکھی تھی جو حقیقتاً سلوک کا مستند اور مفصل ضابطہ ہے۔ رکن دبیر نے بھی حضرت برہان الدین کے ملفوظات نفائس الانفاس نامی مجموعے[7] میں فراہم کئے ہے

---

[1] سیر الاولیاء/۱۰۱ [2] اس کی روداد سیر الاولیاء/۵۲۵ - ۵۳۲ میں ملے گی۔ مولانا فخرالدین زرّادی کا رسالہ کشف القناع عن وجوہ السماع غالباً اسی سلسلہ میں لکھا گیا ہے اور اس میں بھی مناظرے کی کچھ روداد موجود ہے۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ [3] ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی (بحوالہ وحید مرزا/۱۱۲) [4] SEE MY ARTICLE AHSAN AL-AQWAL AN EARLY SOURCE ON HAZRAT SHEIKH FARID PUBLISHD THE 'JOURNAL OF SIKH STUDIES' VOLUME 1, No. 2 (AUGUST, 1974) P 86

[5] یہ دونوں کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں مگر مستی روشن علی کی تصنیف روضۃ الاقطاب میں ان کے حوالے موجود ہیں۔ [6] یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے۔ دکنی زبان میں اس کا ترجمہ میراں یعقوب نے کیا تھا۔ اس کا انتخاب ایک طویل مقدمہ کے ساتھ مدیع حسینی نے رسالہ قدیم اردو (جلد دوم) میں چھاپا ہے۔ شمائل الاتقیاء کے قلمی نسخے نیشنل میوزیم نئی دہلی، ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری، درگاہ شاہ امین الدین اعلیٰ (بیجاپور)، انڈیا آفس اور برٹش میوزیم میں ملتے ہیں۔ راقم الحروف نے نیشنل میوزیم کے نسخوں کو دیکھا ہے۔ [7] یہ کتاب بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ابھی تک صرف ایک قلمی نسخہ معلوم ہے جو کتب خانہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں محفوظ ہے۔

ان کی تصنیف کتاب وصول الواصلین ہے جس کے متعدد اقتباسات شمائل الاتقیا میں آئے ہیں۔

شمائل الاتقیا کی تالیف کا انداز یہ ہے کہ سلوک کے مختلف موضوعات پر مشائخ صوفیہ کی مستند کتابوں سے اقتباسات جمع کئے گئے ہیں جن کتابوں سے عبارتیں ماخوذ ہیں ان میں بعض کے حوالے آئے ہیں دیباچہ میں بھی مولف نے طویل فہرست اپنے مصادر کی درج کی ہے۔ اس کتاب کی تالیف نفائس الانفاس کے بعد ہوئی ہے۔ اور دوران تالیف ہی میں (۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء) حضرت برہان الدین غریب کا انتقال ہو گیا تھا۔ یعنی شمائل الاتقیا کی تالیف کا آغاز تو حضرت کے ایما سے ہوا مگر آپ اس کو تکمیل کے بعد ملاحظہ نہ فرما سکے۔

دیباچۂ شمائل الاتقیا میں مآخذ کی جو فہرست ہے اس میں انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب اور اسرار المحبوبین کے علاوہ راحت المحبین ملفوظ شیخ نظام الدین جمع کردہ امیر خسرو بھی لکھا ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شمائل الاتقیا حضرت امیر خسرو کے انتقال (۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) سے چودہ سال بعد حضرت برہان الدین غریب کے حکم سے لکھی گئی جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں گزارا تھا اور عمر کے آخری دور میں اپنے مرشد کے حکم سے ہی دکن تشریف لے گئے تھے[1] حضرت امیر خسرو سے ان کے قرب اور اختصاص کے تعلقات تھے[2] گویا یہ کتابیں امیر خسرو کی وفات کے بعد لکھی گئی ہوتیں اور ان کا مصنف امیر خسرو نہ ہوتا تو حضرت برہان الدین غریب شمائل الاتقیا کی تالیف میں ان سے استفادے سے احتراز کرتے۔ یہ باور کرنے کے لئے بھی قرینہ موجود ہے کہ چشتی سلسلہ کے صوفیا کی یہ کتابیں حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ ہی دکن پہنچی ہوں گی کیونکہ آپ دکن کو ہجرت کرنے والے متقدمین چشتی صوفیا میں سے ہیں۔ آپ سے پہلے صرف آپ کے برادر خورد حضرت شیخ منتجب الدین ہانسوی (متوفی ۷۰۹ھ) دولت آباد تشریف لے گئے تھے[3]

افضل الفوائد کا نام شمائل الاتقیا میں نہیں آیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا تھا کہ وہ مستند نہیں ہے یا اس وقت تک وجود میں نہ آئی ہوگی۔ اور راحت المحبین امیر خسرو کی تالیف ہے۔ لیکن موخر الذکر کے دیباچہ میں ہے۔

> منگل رجب ۷۱۹ھ کو قدم بوسی کا شرف حاصل کیا میں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے جو کچھ میں نے جناب کی زبان مبارک سے سنا اسے نظم کرتا رہا اور اس کا نام افضل الفوائد رکھا جو منظور نظر عالی ہو چکا۔ اب بھی اگر فرمان ہو تو جو کچھ جناب کی زبان مبارک سے سنا جائے وہ لکھ لیا جائے تاکہ دوسری جلد مرتب ہو جائے لیکن اس جلد میں زیادہ تر انبیاء اور سلوک کی حکایات ہوں تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو آپ نے فرمایا کہ بہتر پھر مسکرا کر فرمایا کہ جو کچھ پہلے دل میں ایسی تمنا تھی اس لئے میں نے زمانہ کے بعد انبیاء کا ذکر شروع کیا ہے[4]

اس سے ظاہر ہے کہ افضل الفوائد پہلی جلد ہے اور راحت المحبین کو اس کی جلد ثانی کی حیثیت سے مرتب کیا گیا ہے اور دوسری جلد کے دیباچے میں جلد اول کا حوالہ ملتا ہے۔ لہٰذا دونوں کتابوں کا انتساب حضرت امیر خسرو سے درست ہے۔

یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے جو سرسری طور پر غیر متعلق معلوم ہوگی مگر اس سے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ ہمارے اس مطالعہ کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔ راحت القلوب کا حوالہ بھی شمائل الاتقیاء میں موجود ہے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات ہیں جن کے مؤلف حضرت نظام الدین اولیاء (وصال ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) بتائے جاتے ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور خود راقم الحروف نے راحت القلوب کے جعلی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے دیکھے ہیں اور سب سے قدیم نسخہ جو میری نظر سے گزرا ہے وہ ۱۰۴۴ھ کا مکتوبہ تھا۔ اس سے میرا خیال تھا کہ راحت القلوب دسویں یا گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہوگی لیکن شمائل الاتقیاء میں اس کا حوالہ دیکھ کر میں اس رائے سے رجوع کر چکا ہوں اگرچہ ابھی تک اس کتاب کے مستند ہونے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ مطمئن نہیں ہوں۔

راحت القلوب کے جعلی ہونے کی دوسری دلیل جس پر بعض اور امور کی صورت میں بھی وارد ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ اس میں پہلی مجلس کی تاریخ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ روز چہارشنبہ درج ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کی تاریخ وفات ۵ محرم ۶۶۴ھ تسلیم کی گئی ہے[5] اور حضرت نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں فرمایا کہ میں نے اجودھن کے ۹ یا ۱۰ سفر کئے[6] جن میں تین سفر شیخ کی حیات میں ہوئے اور باقی سفر ان کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے کئے گئے یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ باباصاحب نے (۹۸) سال کی عمر پائی تھی[7] اور حضرت نظام الدین اولیاء نے باباصاحب کی زندگی کے آخری تین یا چار برسوں میں ملاقات کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں اکثر رمضان کا مہینہ وہاں گذارتے تھے۔ آخری رمضان ہی میں خلافت ملی تھی۔ اور اسی شوال میں دہلی کو واپسی ہوئی تھی[8] جس کے تین بعد محرم میں باباصاحب کا وصال ہو گیا تھا۔

اگر ۶۶۴ھ باباصاحب کی وفات کا سال مان لیا جائے تو حضرت نظام الدین اولیاء کی پہلی حاضری ۶۶۰ھ یا ۶۶۱ھ میں ہو سکتی ہے۔ دُرِّ نظامیہ میں بھی لکھا ہے کہ جب حضرت بابا فرید نے خلافت نامہ لکھوا کر دیا تو حضرت نظام الدین سے فرمایا کہ اسے ہانسی (ہریانہ) میں شیخ جمال الدین کو اور دہلی جا کر قاضی منتجب الدین کو دکھا دینا[9] حضرت نظام الدین نے دل میں سوچا کہ انھوں نے اپنے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کو اجازت نامہ دکھانے کی ہدایت نہیں فرمائی شاید آپ انہیں خود بتا دیں جب دہلی آ کر معلوم ہوا کہ ان کو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور دُرِّ نظامیہ سے صراحت کے ساتھ ان کی تاریخ وفات

---

[1] سیر الاولیاء/۲۸۲ - روضۃ الاقطاب/۱۲۱ [2] اخبار الاخیار (شیخ عبدالحق محدث دہلوی) ص ۹۳-۹۴ [3] دونوں علی روضۃ الاقطاب ص ۱۲۱ [4] راحت المحبین (اردو ترجمہ) ص ۵ [5] اخبار الاخیار ص ۵۴ (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۲ھ) [6] فوائد الفواد/ [7] محمد علی سامانی نے سیر محمدی (تالیف ۸۳۱ھ) میں لکھا ہے کہ ۱۳ رجب ۸۱۸ھ کو حضرت بندہ نواز نے فرمایا کہ آج کے روز میری عمر بھی حضرت شیخ الاسلام فرید الدین مسعود گنج شکر کی عمر کے مساوی ہو چکی یعنی آپ کی عمر شریف بہنگام رحلت ۹۸ سال تھی [8] سیر الاولیاء/۹۹ [9] دُرِّ نظامیہ (باب ۱۳) ص ۱۲۷

ہاں ۶۶۶ھ معلوم ہوتی ہے۔[1] اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بابا صاحب سے خلافت نامہ
اں ۶۶۴ھ میں ملا تھا۔ اور اسی مہینہ میں حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کا انتقال ہوا
۔ اس کے بعد بابا صاحب تقریباً چار سال تک بقیدِ حیات رہے۔

لیکن شمائل الاتقیاء کا جو قلمی نسخہ (مکتوبہ ۱۰۹۱ھ / ۱۶۷۹ء) یہاں نسل
رکم میں محفوظ ہے اس کے آخری ورق پر کسی شخص نے جس کی تحویل میں یہ کتاب رہی
کی بعض یادداشتیں قلم بند کر دی ہیں۔ اس میں حضرت برہان الدین غریب کا نسب نامہ
درج ہے۔ ان کے بھائیوں کے نام بھی بتائے ہیں۔

"اول برہان الدین قتال، دوم بابا محمد عرف حضرت شاہ برہان الدین، سوم
الفتح، چہارم منتخب الدین"۔

اور بہنوں کے نام بی بی عائشہ، بی بی مسہ، بی بی خدیجہ اور بی بی مریم لکھے ہیں۔ یہ بھی
درج ہے کہ آپ کی والدہ کا نام بی بی ہاجرہ تھا۔ اور ۱۱ شوال کو ان کا عرس ہوتا ہے۔ اس
کے بعد بعض تاریخی مادّے درج کئے ہیں جو یہ ہیں۔

۱۔ حضرت نظام الدین اولیاء ۔ شہنشاہِ دین۔ (۷۲۵ھ)
۲۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری۔ آفتابِ ملکِ ہند (۶۳۳ھ)
۳۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔ خواجہ حبیبِ (۶۳۴ھ)
۴۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ۔ کلید گنج شکر (۶۵۷ھ)
۵۔ امیر حسن دہلوی۔ طوطیٔ شکر مقال (۷۲۵ھ)[2]
۶۔ حضرت برہان الدین غریبؒ ۔ نورِ عشق بود (۷۳۸ھ)

اگر ان مادّہ ہائے تاریخی کو درست مان لیا جائے تو کچھ نئے سوالات اُبھرتے ہیں بعض
ملفوظات میں لکھا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے ایک ہی سال میں رحلت کی[3] اور یہ ۶۳۳ھ کا
سمجھا جاتا ہے۔ فوائد الفواد میں التمش کی تاریخ وفات درج ہے۔[4]

"ازاں جا تاریخ نقلِ سلطان شمس الدین یاد کرد بندہ خواجہ ذکرہٗ اللہ بالخیر ایں
بیت بر زبانِ مبارک راند۔

سال ششصد وسی وسہ از ہجرت ؛ ماند شاہجہاں شمس دین عالمگیر (کذا)

سیر الاولیاء میں بھی ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری نے حضرت نظام الدین اولیاء
کی خدمت میں عرض کیا کہ جس سال سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہوا ہے اسی
سال شیخ قطب الدین بختیار کاکی اور مولانا قطب الدین کاشانی نے بھی رحلت فرمائی ہے
سن کر حضرت نظام الدین نے یہ شعر پڑھا[5]

بسال ششصد وسی وسہ بود از ہجرت
نماند شاہجہاں شمس دین عالمگیر (کذا)

لیکن اس شعر کا پہلا مصرع دونوں کتابوں میں ساقط الوزن ہے اس کی طرف
فوائد الفواد کے مطبوعہ ایڈیشن کے مرتب نے بھی توجہ نہیں کی۔ صحیح شکل یہ ہے۔

بسال ششصد وسی وچہار از ہجرت
نماند شاہجہاں شمس دین عالمگیر

اور یہی فوائد الفواد کے بعض قلمی نسخوں میں پائی جاتی ہے۔[6] اس سے معلوم ہوا کہ
۶۳۴ھ میں التمش نے انتقال کیا اور یہی اعداد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے
مادۂ تاریخ وفات، "خواجہ حبیب" سے برآمد ہوتے ہیں۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ حضرت خواجہ
معین الدین اجمیری نے بھی اسی سال رحلت فرمائی تھی۔ اسے ماننے میں ذرا سی دشواری
پیدا ہوتی ہے۔ مادۂ تاریخ وفات "آفتاب ملکِ ہند" سے ۶۳۳ھ مستفاد ہے علی محمود
جاندار نے دُرر نظامیہ میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے آخری سفرِ دہلی کا حال لکھا
ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت ہنوز اجمیر نہ پہونچے تھے کہ دہلی میں حضرت خواجہ
قطب الدین نے انتقال فرمایا۔[7]

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ۱۴ ربیع الاول ۶۳۴ھ کو انتقال فرمایا
اور اس سے تین ماہ کے بعد (رجب ۶۳۴ھ) میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کا وصال
تسلیم کیا جائے گا۔ اس اشکال کو رفع کرنے کی یہ صورت ہے کہ آفتاب کو الف سے لکھا
جائے یعنی قدیم رسم الخط میں الف ممدودہ کو دو الف کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ اس طرح
اس مادے سے بھی ۶۳۴ھ برآمد ہوں گے۔ تاریخ نگاروں نے ایک عدد کی کمی کو جائز
بھی رکھا ہے۔

اب رہا حضرت بابا فرید گنج شکر کے انتقال کی تاریخ کا مادہ "کلید گنج شکر" تو اس سے
۶۵۷ھ / ۱۲۵۸ء برآمد ہوتے ہیں۔ اگر اسے صحیح مانا جائے تو بعض اشکال پیدا ہوتے ہیں اور
بعض رفع بھی ہو جاتے ہیں۔

(الف) ۶۵۷ھ تاریخ وفات مانیں تو حضرت نظام الدین اولیاء کی پہلی حاضری کا سنہ
۶۵۵ھ ہو جاتا ہے جو راحت القلوب میں دیا ہوا ہے۔

(ب) حضرت امیر خسرو اپنے والد امیر سیف الدین محمود کے ساتھ آٹھ سال کی عمر میں
حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے امیر خسرو کی ولادت[8] ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء
میں ہوئی ان کے والد کا انتقال ۶۵۹ھ / ۱۲۶۱ء میں ہوا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امیر خسرو جس
سال پہلی بار اپنے والد کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں باریاب ہوئے ہیں
اسی سال یا اس سے ایک سال کے بعد ان کے والد نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہے اگر یہ خیال درست
ہے کہ حضرت نظام الدین کے مرید ہوئے ہیں تو حضرت اس وقت تک کسی کو بیعت نہیں کر سکتے تھے،
جب تک خود آپ کو خلافت و اجازت نہ ملی ہو لہذا یہ ماننا لازم آئے گا کہ ۶۵۹ھ تک حضرت
نظام الدین کو اجازت مل چکی تھی اور اس سے بھی بابا فرید گنج شکرؒ کا سنہ وفات ۶۵۷ھ تسلیم

---

[1] دُرر نظامیہ (باب ۱۴) ص ۱۲۰ ، [2] یہ تاریخ وفات حضرت امیر خسرو کی ہے اور ان کے مزار کے کتبہ پر یہی کندہ ہے۔ امیر حسن دہلوی کا انتقال ۷۳۸ھ میں ہوا تھا [3] اخبار الاخیار/۲۳
[4] فوائد الفواد ۲۹۵ ، سیر الاولیاء/۵۶ ، [5] سیر الاولیاء ۵۶ [6] فوائد الفواد (قلمی نسخہ برٹش میوزیم۔ ورق ۸۲ [7] دُرر نظامیہ (باب ۲۴) ص ۲۱ ، [8] سالِ
ولادت کا موضوع پر تفصیل سے بحث کا موقع نہیں ہے لیکن ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی ولادت کا زمانہ ۶۵۲ھ متعین کیا ہے میرا خیال ہے کہ یہ ۶۵۱ھ ہونا چاہیئے۔ اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں شہزادہ
سلطان محمد کے مرثیہ میں بھی امیر خسرو نے لکھا ہے کہ اب ۶۸۴ھ ہے اور میری عمر ۳۴ سال ہو چکی ہے (دیکھو وحید مرزا) ص ۶۳ وغیرہ۔

کہ اس کی ایک قوی دلیل مل جائے گی۔

مگر اس کے سوا ۷۵۲ھ کو تاریخ وفات ماننے سے کچھ اور عقدے پیدا ہوں گے جن کی تفصیل موجودہ موضوع کے احاطے سے باہر ہے اس لئے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں اور ابی الحال راحت المحبین کے بارے میں اسی سابقہ رائے پر قائم ہوں

دراصل بزرگان چشت کے بارے میں تاریخوں کا تذکرین کا زیادہ تر دار و مدار ملفوظات ہی پر ہے۔ اور اس کا یہ حال ہے کہ صرف ایک بار (۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء) دہلی سے چھپی ہے۔ اور اس کا متن بھی ایک اٹھارھویں صدی عیسوی کے مخطوطے پر مبنی ہے اس میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ تحریف اور رد و بدل بھی ہوا ہے اور بیشتر مواقع پر ناشر یا مرتب سے صحیح عبارت پڑھی ہی نہیں گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کا ایک تنقیدی متن تمام معلوم قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا جائے اور یہ کام راقم الحروف نے شروع کر رکھا ہے۔

افضل الفوائد میں (۳۴) مجلسوں کے ملفوظات ہیں جن میں پہلی مجلس کی تاریخ ۲۴ ذی الحجہ ۷۱۳ھ اور آخری مجلس اردی قعدہ ۷۱۵ھ یک شنبہ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر تاریخوں کا مقابلہ تقویم سے کیا گیا تو مطابقت نہیں پائی گئی۔ اس کی تفصیل بیان شاید غیر دلچسپ ہوگی۔ مگر اشارتاً ایک مثال لکھنا کافی ہے۔

(الف) افضل الفوائد کی تیسری مجلس کی تاریخ ۱۰ محرم (۷۱۴ھ) بتائی گئی ہے۔ اور دن پنجشنبہ لکھا ہوا ہے۔ اس حساب سے ۱۲ محرم کو جمعہ ہونا چاہئے مگر وہاں اس تاریخ کو دن چہارشنبہ بتایا ہے۔

حاضرین مجلس میں مولانا شمس الدین یحییٰ مولانا برہان الدین غریب، مولانا فخر الدین زرادی مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی اکثر مجلسوں میں موجود ہیں۔ لیکن ایک محفل میں مولانا جمال الدین ہانسوی بھی حاضر ہیں اور ان کی موجودگی میں محفل سماع برپا ہوتی ہے اس میں اگر کتابت کی غلطی نہیں ہے اور تمام قلمی نسخوں میں شیخ جمال ہانسوی ہی کا نام ملتا ہے تو یہ افضل الفوائد کے جعلی ہونے کی قوی ترین داخلی شہادت مانا جائے گا۔ کیونکہ شیخ جمال الدین ہانسوی کا انتقال حضرت بابا فرید گنج شکر کی حیات ہی میں ہو چکا تھا اور اس کا حوالہ دُررِ نظامیہ میں بھی دیا گیا ہے۔[1] ۷۱۴ھ میں وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں کیسے موجود ہو سکتے ہیں۔ ان کا حال بھی اس طرح لکھا ہے[2] کہ جب وہ آئے تو آداب بجا لاکر بیٹھ گئے۔ حالانکہ حضرت شیخ جمال ہانسوی حضرت بابا فرید گنج شکر کے خلیفہ اول تھے۔ اور جب بابا فرید صاحب کسی کو خلافت نامہ لکھ کر دیتے تھے تو یہ حکم بھی ملتا تھا کہ اسے ہانسی میں شیخ جمال کو (تصدیق کے لئے) دکھا دینا خود حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی اپنا خلافت نامہ انھیں لاکر دکھایا تھا۔ تو انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا۔[3]

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس

ان کے ساتھ ہی محفل سماع میں رقص کرنے والے شیخ عثمان سیاح ہیں یہ حضرت ابوالفتح شیخ رکن الدین سہروردی کے مرید تھے اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی مجالس میں اکثر آیا کرتے تھے۔[4] شیخ جمال ہانسوی سے عمر اور رتبہ میں یقیناً بہت کم تھے ان کے سامنے سماع میں وجد کرنا یوں بھی ادب کے خلاف ہوتا۔ اور شاید شیخ کے وہ مرید تھے اس سنت پر عامل ہوں تو ممکن ہے کہ سماع سے بالکل ہی محترز رہتے ہوں۔

افضل الفوائد کی پہلی مجلس ۷۱۳ھ کی ہے اور اسی سنہ کی سترہ (۱۷) مجالس فوائد الفواد کی جلد سوم میں موجود ہیں جن میں آخری محفل ۲۱ ذی قعدہ ۷۱۳ھ کی ہے ان تاریخوں کے آس پاس ہی افضل الفوائد کی مجالس قلم بند ہوئی ہیں مگر فوائد الفواد میں نہ وہ شخصیات نظر آتی ہیں نہ وہ موضوعات ہیں جو مجلس امیر خسرو کے مرتب کردہ ملفوظات میں ملتے ہیں۔

ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ افضل الفوائد کا مسودہ امیر خسرو نے حضرت نظام اولیاء کے ملاحظہ میں پیش کیا تھا

"ستائیسویں ماہ جمادی الثانی کو پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس روز میں نے، جز جن میں خواجہ راستان کے الفاظ دُربار لکھے تھے حاضر خدمت کئے اور عرض کیا کہ آج تک کچھ بندہ نے جناب کی زبان مبارک سے سنا، اپنی سمجھ کے مطابق اسے قلم بند کرتا رہا اور اس کا نام افضل الفوائد رکھا جناب نے یہ سن کر ان اجزا کا مطالعہ کر کے فرمایا کہ اچھا لکھا ہے اور عمدہ نام رکھا ہے۔ اور جہاں کہیں مجھ سے کوئی بات رہ گئی تھی اپنے دست مبارک سے لکھ دی۔"[5]

اسی بیان فوائد الفواد کو شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کے بارے میں امیر حسن نے بھی لکھا ہے ۲۴ محرم ۷۱۴ھ کی مجلس میں ہے

"سعادت پابوس بدست آمد۔ آں روز بندہ مجلداول کہ ہم اریں فوائد الفواد جمع کردہ شدہ است، بحکم فرمان پیش برد چوں مطالعہ فرمودہ مشرف استحسان ارزال داشت و فرمود کہ نیکو نوشتہ ای و درویشانہ نوشتہ ای و نام ہم نیکو کردہ ای۔"[6]

ان دونوں بیانوں کا لفظاً و معناً ایک ہو جانا قوی شبہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرا قابل لحاظ پہلو یہ ہے کہ ان "جعلی" ملفوظات میں ایسا مواد بالکل نہیں ہے جو اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات پر روشنی ڈالتا ہو یہی کیفیت افضل الفوائد کی بھی ہے مگر اس کے برخلاف فوائد الفواد، دُررِ نظامیہ، سیر الاولیاء، خیر المجالس یا احسن الاقوال تاریخ کے طالب علم کو بہت سی مختصر مگر قیمتی معلومات بکھری ہوئی مل جاتی ہیں۔

تصوف اور مذہب کی کتابوں کے حوالے بھی ان ملفوظات میں کثرت سے آتے ہیں اور ان کا انداز بھی شک انگیز حد تک مماثل ہے۔ افضل الفوائد میں بھی چالیس کتابوں کے حوالے آئے ہیں ان میں کچھ کتابیں اوراد و وظائف کے مجموعے ہیں کچھ تصوف کے موضوع پر ہیں تیسرے نمبر پر فقہ اور تفسیر کی کتابیں ہیں۔ جن میں تفسیر کشاف للزمخشری تفسیر امام زاہدی، تفسیر امام ناصری اور تفسیر امام مجاہد کے علاوہ ایک نام تفسیر خواجہ شفیق بلخی بھی ملتا ہے

[1] دُررِ نظامیہ (باب ۲۸) ص ۲۴۰ سیر الاولیاء / ۱۰۰ [2] افضل الفوائد (اردو ترجمہ) ۹ [3] دُررِ نظامیہ (باب ۱۳) ۱۲۱ ۱۲۰ [4] اخبار الاخیار ص ۱۳۱ [5] افضل الفوائد ۸۸ [6] فوائد الفواد ۱۹۸

قند کی کتابوں میں ابو اللیث سمرقندی کے رسائل اس زمانے میں بہت مقبول تھے ایک موقع پر صرف اس طرح حوالہ دیا ہے: "خواجہ امام ابو اللیث سمرقندی کی کتاب میں دکھایا ہے" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنی معروف تصنیف تھی کہ اس کا نام لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ دوسری بعض کتابیں جن کے علاوہ صلوٰۃ مسعودی کا نام بھی صرف ایک مجلس میں آیا ہے اس کے مصنف شیخ ابو عطا مسعود بن محمود بن یوسف سمرقندی ہیں خواجہ حمید الدین ناگوری کی دو کتابوں کے نام آئے ہیں ایک راحت الارواح دوسری لوائح۔ ایک اور تصنیف تحفۃ العارفین کا نام بھی مجلسوں میں آیا ہے اور ایک موقع پر اسے مولانا علاء الدین بدایونی کی تصنیف بتایا ہے۔ بظاہر مولانا علاء الدین اصولی بدایونی ہو سکتے ہیں جن سے حضرت نظام الدین اولیاء نے فقہ کی کتاب قدوری کا درس بھی لیا تھا تذکرۃ الاولیاء نامی کتاب جس کا حوالہ دو بار آیا ہے حضرت شیخ فرید الدین عطار کی مشہور زمانہ تالیف ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا حوالہ حضرت نظام الدین کے دوسرے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد یا دُررِ نظامیہ میں نہیں ملتا۔ اگرچہ بعض باتیں صریحاً اس سے ماخوذ ہیں یا دونوں کتابوں میں بڑی حد تک مشترک ہیں۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ افضل الفوائد کے نصفِ اول میں کتابوں کے حوالے زیادہ ہیں۔ اور آخری نصف حصے میں بہت کم ہو گئے ہیں۔ راحت المحبین جو اسی کا ضمیمہ ہے اس میں اور بھی کم ہیں۔

افضل الفوائد میں ۱۵، ۱۶ کی مجلس قلم بند ہوئی ہیں اور فوائد الفواد جلد چہارم میں اسی سنہ کی (۱۱) مجلسوں کے ملفوظات ہیں۔ دونوں کتابوں کے مشمولات اور مطالب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق نظر آئے گا یہ کس طرح ممکن ہے کہ امیر حسن دہلوی ایک ہی ماہ و سال میں جو ملفوظات قلمبند کریں گے ان میں دقیق مضامین اور بہترین علمی نکات ہوں اور اسی زمانے میں امیر خسرو جن ملفوظات کو لکھیں وہ معمولی معانی اور قصص الانبیاء وغیرہ پر مشتمل ہوں؟

دوسرا پہلو ان کتابوں کے اسلوبِ نگارش کا ہے۔ امیر حسن دہلوی نے حتی الامکان وہی الفاظ قلم بند کئے ہیں جو حضرت نظام الدین اولیاء کی زبان مبارک سے نکلے ہیں[1]۔ اس لحاظ سے فوائد الفواد۔ صرف اس دور کی معیاری فارسی گفتگو کا نمونہ ہے بلکہ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کا طرز کلام کیا تھا۔ اس کے برخلاف اگر امیر خسرو نے بطور خود یعنی اپنے الفاظ میں افضل الفوائد کے مطالب کو لکھا ہے تو اس کی فارسی امیر خسرو کے اسلوب اور مرتبۂ نگارش سے کمتر ہے اور ان کی دوسری سب تصانیف سے مختلف بھی ہے۔ خزائن الفتوح میں تو وہ بہت ہی مرصع نگار بن گئے ہیں۔ لیکن اعجاز خسروی کے رسائل میں انھوں نے فارسی نثر کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان میں سے کسی کا اسلوب بھی افضل الفوائد سے نہیں ملتا اگر یہ کہا جائے کہ امیر خسرو نے جیسا سادہ ہی قلم بند کیا ہے جو ملفوظات معین ملفوظات کرتے ہیں تو افضل الفوائد کے اسلوب کو فوائد الفواد کے طرز سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہئے۔ جن لوگوں نے اس تالیف کے جعلی ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کی دلیلوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

افضل الفوائد اور راحت المحبین میں حضرت نظام الدین اولیاء، آپ کے شیوخ یا معاصرین کے بارے میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں۔ مثلاً سیر یا اس سے زیادہ صحت، وضاحت یا جزئی تفصیلات کے ساتھ درج ہو البتہ بہت سے مضامین وہ ہیں جو دوسری کتابوں میں بھی تقریباً اسی انداز سے بیان ہوئے ہیں یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔

افضل الفوائد میں ہے کہ ایک مرتبہ مولانا کیتھلی میرے پاس آئے کھانا موجود تھا، نوکر کو کہا کہ لاؤ۔ اس نے لانے میں دیر کر دی میرے پاس ایک چھوٹی چھڑی تھی اس کی پیٹھ پر ماری، مولانا کیتھلی نے اس طرح آہ کی کہ گویا انہیں کی پیٹھ پر لگی ہے میں نے پوچھا آپ نے آہ کیوں بھری؟ فوراً پیٹھ سے کپڑا اٹھا کر مجھے دکھایا جب میں نے نگاہ کی تو دیکھا اس چھڑی کا اثر آپ کی پیٹھ پر موجود تھا[2]۔ یہ واقعہ سیر الاولیاء وغیرہ میں بھی بیان ہوا ہے۔

اسی طرح افضل الفوائد میں ہے "سلطان شمس الدین انار اللہ برہانہ کی یہ عادت تھی کہ آدھی رات کے وقت عبادت میں مشغول ہوتا اور جب جاگتا تو خود پانی لے کر وضو کرتا۔ غلاموں میں سے کسی کو نہ جگاتا۔ جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ اپنی تکلیف دوسرے کو کیوں دوں کہ انھیں نیند سے جگاؤں[3]۔"

فوائد الفواد میں یوں ہے "از عقیدۂ خوب او در التمش، حکایت فرمود کہ شبہا بیدار بودے وچوں از خواب بیدار شدے وضو ساختے دوگانہ گزاردے، وباز در خواب شدے و ہیچ کس را بیدار نکردے[4]۔"

افضل الفوائد میں ہے کہ خواجہ بایزید بسطامی کا ایک ہمسایہ یہودی تھا، جب اس سے پوچھا گیا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ تو اس نے کہا اگر مسلمانی وہ ہے جو بایزید کو حاصل ہے تو مجھ سے ہو نہیں سکتی اور اگر یہ ہے جو تمہیں حاصل ہے تو اس کے حاصل کرنے سے مجھے شرم آتی ہے[5]۔"

فوائد الفواد کی ۴ رمضان ۷۱۰ھ کی مجلس میں ہے "حکایت فرمود کہ یہودے در جوار خانۂ بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ العزیز خانہ داشت چون خواجہ بایزید نقل کرد آں یہود را گفتند کہ تو چرا مسلمان نمی شوی؟ یہود گفت چہ مسلمان شوم اگر اسلام آنست کہ بایزید داشت آں اسلام از من نیاید واگر اینست کہ شما دارید مرا ازیں اسلام عار می آید[6]۔"

ان دونوں کتابوں سے پہلے یہ واقعہ شیخ فرید الدین عطار کے تذکرۃ الاولیاء میں اس طرح آیا ہے "گبرے را گفتند کہ مسلمان شو، گفت اگر مسلمانی اینست کہ بایزید می کند من طاقت ندارم و نتوانم کرد، و اگر اینست کہ شما می کنید بدین هیچ اعتقاد ندارم[7]۔"

ایک مجلس میں امیر حسن علا سجزی حاضر ہیں اور انھوں نے "رباعی" پڑھی ہے[8] مگر وہ رباعی کے وزن میں نہیں ہے امیر حسن یا امیر خسرو جیسے شاعروں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اوزانِ رباعی سے ناواقف ہوں گے۔

---

[1] امیر حسن دہلوی کا بیان ہے کہ میں تقریر سلطان المشائخ در امکان رعایت کردم" (سیر الاولیاء/ ۳۰۸) [2] افضل الفوائد ۱۴ [3] افضل الفوائد ۱۴ [4] فوائد الفواد ۲۵۹ [5] افضل الفوائد ۲۱ [6] فوائد الفواد: ۲۰۸ [7] تذکرۃ الاولیاء ۹۰ (مطبع عمری لاہور، ۱۳۱۷ھ)، [8] افضل الفوائد ۲

افضل الفوائد میں ایک موقع پر یہ شعر آیا ہے۔[1]

داری سرِ ما وگرنہ دور از برِ ما
ما دوست کشیم و تو نداری سرِ ما

یہی شعر فوائد الفواد میں بھی دو جگہ آیا ہے[2] مگر یہ ایک رباعی کے آخری دو مصرعوں میں پہلی رباعی شیخ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ اولیاء میں ہے۔[3]

خون ریز بود ہمیشہ در کشورِ ما
جان عود بود ہمیشہ در مجمرِ ما
داری سرِ ما اگر نہ دور از برِ ما
ما دوست کشیم و تو نداری سرِ ما

افضل الفوائد میں نظامی گنجوی کے یہ دو شعر حضرت نظام الدین اولیا کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں۔[4]

چو مست طلوتش گشتی ملک را حمدہ بر ہم زن
ستون بہ ش در جنبان طناب آسمان در کش
طرنعیش لے قدم می زن حدیث بے زبان میگو
جوابش بے لعرے می‌ شراش بے دہان کش

اور ۴ جمادی الثانیہ ۱۲، ھ کی مجلس میں جو فوائد الفواد میں ہے[5] آپ نے اسی غزل کا صرف مطلع پڑھا ہے اور فرمایا کہ ایک دن حضرت بابا فریدؒ سے تمام دن پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ افطار کا وقت آگیا۔

نظامی این چہ اسرار است کز خاطر عیاں کردی
یکے سرّ حق نمی داند زبان در کش زبان در کش

پھر رات بھر اسی کو پڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ سحری کا وقت آگیا" یہی ملفوظ دُررِ نظامیہ میں بھی ملتا ہے۔[6]

افضل الفواد[7] میں حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کی آخری علالت اور وفات کا حال بھی ہے۔ اور وہ دوسرے تمام ماخذوں سے قدرے مختلف ہے۔

"فرمایا کہ خواجہ فرید قدس اللہ سرّہٗ العزیز نے پانچویں محرم کو انتقال فرمایا اور یہ اس طرح ہوا کہ جس رات انتقال ہونے والا تھا مجھے یاد فرمایا کہ مولانا نظام الدین موجود نہیں اور یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے خواجہ شیخ قطب الدین کے انتقال کے وقت موجود نہیں تھا۔ وہ بھی موجود نہیں (پھر فرمایا کہ جب آپ کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اور صبح سے دس بجے تک پانچ مرتبہ قرآن شریف پڑھا۔ پھر ذکر الٰہی میں ایسے مشغول ہوئے کہ آپ کے ہر بُن مُو سے خون جاری ہوا اور جو قطرہ خون کا زمین پر گرتا اس سے اللہ کا نقش زمین پر بنتا) اور یہ رباعی پڑھ کر سجدہ کرتے اور پھر سر اٹھا لیتے۔

بوئے خوش تو ز ہر چمن می شنوم
شرح غم تو ز خویشتن می شنوم
گر ہیچ نباشد کہ کسے ہم نامم
تا نام تو گوید و من می شنوم

جب ذکر سے فارغ ہوئے تو لوگ نزدیک آ بیٹھے آپ نے انھیں فرمایا کہ باہر جا کر بیٹھو جس وقت میں بلاؤں گا اندر آجانا۔ دیر بعد آواز آئی کہ اب دوست دوست سے ملے گا۔ سب اندر آئے تو خواجہ صاحب کو کسی اور ہی عالم میں متغرق پایا۔ جب عشار کا وقت قریب ہوا تو آپ نے چار رکعت عشار کی نماز ادا کی پھر سجدہ میں سر رکھ کر جان حق کے حوالے کی پھر آواز آئی جسے اجودھن کے سارے باشندوں نے سنا کہ زمین پر امانت تھی سو حق کے سپرد ہوئی۔"

اس بیان میں جس عبارت کو ہم نے قوسین میں بند کر دیا ہے مجھے اس کے الحاقی ہونے کا شبہ ہے کیونکہ ایسی مبالغہ آمیز باتیں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنی مجلسوں میں بیان نہیں کیں جو دوسری جعلی ملفوظات کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

اسی طرح ایک مجلس میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو صحابی ظاہر کیا ہے حالانکہ وہ تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ داتا گنج بخش کی کشف المحجوب حضرت کے مطالعے میں رہتی تھی۔ اور فوائد الفواد میں اس کا حوالہ بھی آیا ہے۔ اس میں بھی خواجہ حسن بصریؒ تابعی کہا گیا ہے۔ مگر افضل الفوائد میں ہے۔

"بعد ازاں خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ کے برکت حاصل کرنے کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ زبان مبارک سے فرمایا کہ خواجہ صاحب ابھی بچے ہی تھے کہ فخر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے کوزے سے پانی پی لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کوزے سے کس نے پانی پیا؟ عرض کیا کہ حسن نے۔ فرمایا چونکہ اس لڑکے کو دستِ پانی پی لیا ہے اس لئے علم اس میں اثر کرے گا۔"[8]

دوسرے موقع پر یہ بیان ہوا ہے کہ خواجہ حسن بصری کی والدہ حضرت ام سلمہ امّ المومنین کی متولی تھیں۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن حسن بصری کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں (غالباً ۲۱ھ یا ۲۲ھ) ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کے صحابی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ روایات میں یہ آیا ہے کہ جب آپ کا شیر خوارگی کا زمانہ تھا آپ کی والدہ حضرت امّ سلمہ اپنا دودھ پلادیا کرتی تھیں اس کی برکت سے آپ کی حکمت و فصاحت کا مرتبہ ہوا۔[9]

خواجہ حسن بصری کا نام فوائد الفواد میں صرف پانچ جگہ آیا ہے[10] مگر افضل الفوائد میں متعدد بار آپ کا تذکرہ ہوا ہے[11] اور اس میں بیشتر وہ روایات و حکایات ہیں جو شیخ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ الاولیاء میں بھی ملتی ہیں۔[12]

افضل الفوائد[13] میں ہے۔ "فرمایا کہ میں نے شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ

[1] افضل الفوائد، ۲۵، [2] فوائد الفواد ص ۴، ۵۰۷، [3] تذکرۃ الاولیاء ۶ [4] افضل الفوائد ۱۹، [5] فوائد الفواد ۱۴۲، [6] دُررِ نظامیہ (ق۲) ص ۲۲۸-۲۲۹، [7] افضل الفوائد ۹۳، [8] افضل الفوائد ۸۹ (یہی عبارت تذکرۃ الاولیاء/۱ میں ملتی ہے) [9] طبقات ابن سعد جلد، ص ۱۵۶-۱۷۸ (طبع بیروت ۱۹۵۸ء) [10] فوائد الفواد، ص ۱۱۹-۱۲-۱۳۸-۱۸۶-۲۲۳ [11] ملا صفات ۸۹ وغیرہ [12] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۶-۱۸ [13] افضل الفوائد ۴۸

،رہاں مبارک سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مغلوں نے نیشاپور پر حملہ کیا تو اس شہر کے خلیفہ نے کسی
خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا کہ دعا کریں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا
اب دعا کا وقت گزر چکا ہے۔ اب تقدیر پر شاکر رہ کر بلائے الٰہی کے لئے مستعد رہو۔" یہ
روایت بھی فوائد الفواد[۱] میں ۱۰ ربیع الآخر ۷۱۳ھ کی مجلس میں بیان ہوئی ہے "رواں
روز کفار تاتار شہر چون بلائے معین ، نیشاپور رسید بادشاہ سے کس را پیش
شیخ فریدالدین عطار فرستاد کہ دعائے بکن او جواب گفت کہ وقت دعا گذشت وقت
رضا است یعنی بلائے خدا نازل شد من رضا بداد۔"

افضل الفوائد[۲] کی مکرر روایتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت خواجہ
قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ایک بار حوض شمسی میں ہاتھ ڈال کر گرم گرم کاک (روٹیاں)
نکال لی تھیں اس دن سے ان کا لقب 'کاکی' ہو گیا۔ حالانکہ حضرت نظام الدین
نے دوسرے مواقع پر کاکی کی وجہ تسمیہ کے لئے دوسری روایات بیان کی ہیں۔ اور اس روایت
میں افضل الفوائد منفرد ہے۔

دوسری جلد کا نام راحت المحبین ہے جیسا کہ ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے
اس کتاب کا حوالہ شمائل الاتقیاء میں متعدد بار آیا ہے لیکن پروفیسر محمد حبیب نے اپنی
کتاب میں افضل الفوائد یا راحت المحبین کا قطعاً نام نہیں لیا وحید مرزا نے افضل الفوائد
پر ایک نوٹ لکھا ہے اور اس سے اعتنا کیا ہے۔ مگر ان کی کتاب میں راحت المحبین کا
کہیں تذکرہ نہیں ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے وجود سے بے خبر ہیں اور جن قلمی
نسخوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے ان میں راحت المحبین شامل نہیں رہی ہو گی۔ اس میں
صرف سترہ (۱۷) مجلسوں کا حال ہے۔ جن میں سے پہلی مجلس کی تاریخ ۲ رجب ۷۱۹ھ بتائی
گئی ہے اور آخری مجلس ۵ محرم ۷۲۱ھ کی ہے۔ حاضرین محفل میں پندرہ (۱۵) حضرات کے
نام آئے ہیں جن میں اکثر وہی ہیں جو افضل الفوائد کی مجلسوں میں بھی ملتے ہیں۔ امیر حسن
علاء سجزی کا نام صرف دو جگہ آیا ہے[۳] مولانا جلال الدین، خواجہ قطب الدین ہانسوی، شیخ
عثمان سیاح اور شیخ حسین سبزۂ خواجہ بختیار کاکی بھی حاضرِ محفل میں ہیں۔

راحت المحبین میں کتابوں کے حوالے حیرت انگیز حد تک کم ہیں پوری کتاب میں صرف
چھ حوالے آئے ہیں۔ آثار الاولیاء، ریاحین، قصص الانبیاء، حالات خواجہ معین
الدین اجمیری۔ تنبیہ الواللبیت سمرقندی۔ فتاوی اور اسرار الاولیاء۔ لیکن یہ آخری کتاب
غالباً اس مجموعۂ ملفوظات سے مختلف ہے جسے حضرت سید صدرالدین اسحاق دہلوی سے
منسوب کیا جاتا ہے ہو سکتا ہے یہ کاتب کی غلطی ہو اور یہاں بھی نام آثار الاولیاء کا ہو
اس صورت میں کل حوالے صرف چھ ہی رہ جائیں گے۔

راحت المحبین میں گیارہ مجلسیں تو صرف قصص الانبیاء ہی پر مشتمل ہیں یہ زیادہ تر
ان کتابوں کے مضامین ہیں جو حالات انبیاء میں لکھی گئی ہیں اور اسلام کے ابتدائی عہد ہی سے
بہت مقبول رہی ہیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ خدا نے ہر قوم میں انبیاء کو مبعوث کیا تھا۔
لیکن صرف چند پیغمبروں کے نام قرآن میں ملتے ہیں۔ اور ان میں بھی صرف بعض کا نام ہی آیا ہے
اور کوئی تفصیل نہیں ہے۔ لیکن جن نبیوں کا تذکرہ عہد نامہ قدیمہ میں موجود ہے ان کے
حالات یہودی علماء نے قصص و اساطیر کی شکل میں جمع کر رکھے تھے۔ بعد کو مسلمانوں میں بھی
وہی شائع ہو گئے اور ان کی نیم تاریخی حیثیت کے پیش نظر علماء اسلام نے انہیں "اسرائیلیات"
کا نام دیا ہے پہلے یہ قصے وعظ و تذکیر کی محفلوں میں بیان کئے جاتے تھے اور جب عہد دولت
آیا تو ان پر مستقل کتابیں بھی معرض وجود میں آگئیں۔ راحت المحبین میں وہی سب مواد
ہے۔ مگر اس کے وجود پر اس لئے حیرت ہے کہ جس محفل میں مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا
فخر الدین زرادی، مولانا وجیہ الدین پائلی اور مولانا نصیر الدین محمود چراغ دہلی جیسے عالم
فاضل موجود ہوں وہاں ان قصوں کے بیان کرنے کی افادیت کیا ہو سکتی ہے؟

یہاں ہم نے دونوں کتابوں کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ جن دلائل
کی بنیاد پر ان کتابوں کو جعلی سمجھا گیا ہے ان کے ساتھ ہی وہ پہلو بھی پیش کر دیئے ہیں،
جن سے ان کا پایۂ استناد معتبر ہوتا ہے۔ لیکن جب تک دونوں کتابوں کے متعدد قلمی
نسخے سامنے نہ ہوں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں قطعاً جعلی سمجھا جائے یا امیر خسرو کی
مستند تصانیف میں ان کا شمار کیا جائے۔ ایک دشواری یہ ہے کہ ان کا متن تحقیق کے ساتھ
مرتب ہو کر ابھی تک نہیں چھپا ہے۔ اور جو تراجم شائع ہوئے ہیں ان پر بھروسہ نہیں کیا
جا سکتا۔

---

[۱] فوائد الفواد ۹۰ [۲] افضل الفوائد ۳۴ [۳] راحت المحبین (اردو ترجمہ) ۱۳۱، ۱۵۱

بشکریہ نیا دور

تختۂ ملکیت اوقاف سہ ماہی

مقام اشاعت	۵۔ سردار پٹیل مارگ الہ آباد کینٹ
وقفۂ اشاعت	سہ ماہی
پرنٹر پبلشر ایڈیٹر	حکیم اجمل خاں۔ ۵ سردار پٹیل مارگ الہ آباد کینٹ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	پنجاب وقف بورڈ (اوقاف) الہ آباد کینٹ

میں حکیم اجمل خاں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط
اجمل خاں

سچا طور پر دعویٰ کیا ۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی ریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

اور جب ہندی شاعری کا فن پیدا ہوا تو معلوم نہیں کتنے ہندی گیت دوہے، مکرنیاں،
چوپائیاں اور پہیلیاں لکھ کر فکر کے ساتھ یہ آواز بلند کی ۔

چو من طوطی ہندم راست پرسی
زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

اور جب نثر لکھنے پر آمادہ ہوئے تو اعجاز خسروی کی پانچ جلدیں ان میں ایک ہزار ایک سو
اسی صفحے لکھ کر اپنی قوت تحریر کی ساحرانہ دکھادی اور جب تصوف کی راہ پر گامزن
ہوئے تو جس عشق مجازی کا راگ اپنی غزلوں میں الاپنا شروع کیا تھا، وہ عشق الٰہی سے
بدل گیا جس میں رفتہ رفتہ ایسی شورش پیدا ہوئی کہ ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
اولیا فرمایا کرتے کہ حشر کے روز مجھ کو امید ہے کہ اس ترک بچے کے سوز سینہ کی وجہ سے
بخشا نصیب ہو جائے گی، اور بقول مولانا شبلی امیر کا ہر حرف شعلہ بن گیا ہے وہ ایسی واری
ایمن کی شرر باریاں ہیں اور جب فن موسیقی کی تحصیل میں مشغول ہوئے تو بقول محمد حسین آزاد
ان کی طبیعت ایک ہی فن کی بھی جوش کھانے پڑی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں
کہ انہوں نے عام بول چال کی ہندی میں جو گیت لکھے وہ نہ صرف ان کی زندگی میں مقبول
ہوئے بلکہ ایسی مثال نہیں ہے کہ جو گیت چھ سو برس پہلے لکھے گئے، وہ اب تک مقبول ہیں
اور وہ کسی ترمیم کے بغیر اب تک عوام میں گائے جاتے ہیں[6]

ان تمام محاسن کے ساتھ ان کا نمایاں وصف یہ بھی رہا کہ جس طرح ان کو اپنے شاہی
آقاؤں سے والہانہ لگاؤ رہا جس طرح ان کو اپنے فن شاعری سے وارفتگی رہی یا جس طرح
ان کو اپنے مرشد سے عشق رہا اسی طرح ان کو اپنے وطن، اور اس کی ہر چیز سے شیفتگی، سرشاری
اور سرمستی رہی ۔

دھلی کے فراق سے بے چینی

ان کی پیدائش پٹیالی ضلع ایٹہ (یو پی) میں ۱۲۵۳ء میں ہوئی لیکن ان کی نشوونما
دہلی میں ان کے نانا عماد الملک کے یہاں ہوئی، جو سلطان شمس الدین التتمش کے عہد سے
بلبن کے زمانے تک عرض ممالک کے عہدہ پر فائز تھے۔ نانا کی وفات کے بعد پہلے سلطان غیاث الدین
بلبن کے بھتیجے کشلی خاں کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے، پھر بلبن کے لڑکے شہزادہ
بغرا کے یہاں سامانہ چلے گئے، وہ ۱۲۸۰ء میں اپنے باپ کے ساتھ لکھنوتی گیا تو اس کی معیت
میں خسرو بھی تھے، لکھنوتی پہنچے تو دہلی کو یاد کرکے تڑپنے لگے، ان کے دوستوں میں اس
زمانہ کے مشہور شاعر شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے ان کی ہر قسم کی دلجوئی کی لیکن
وہ وہاں نہ رکے، اور جب سلطان غیاث الدین بلبن کے ساتھ دہلی واپس ہوئے تو

اپنے دیوان غرۃ الکمال (نوشتہ ۱۲۹۳ء) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ لکھنوتی سے نکلے تو
ان کو معلوم ہوا کہ گویا حضرت یوسف چاہ زنداں سے نکل آئے ہیں، جب وہ دہلی پہنچے تو
ان کو محسوس ہوا کہ حضرت یوسف مصر پہنچ گئے ہیں نہیں ہے ان کی وطنی محبت بیدار ہوتی
جو آگے برابر بڑھتی گئی ۔

لکھنوتی سے واپسی کے بعد سلطان غیاث الدین کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد سلطان
کے ندیم خاص ہو کر اس کے ساتھ ملتان چلے گئے، ان کے ساتھ ان کے محبوب دوست
امیر حسن دہلوی بھی تھے، شہزادہ محمد سلطان کی صحبت میں ان کے شاعرانہ ذوق کی تشنگی
بجھتی رہی، وہ ان کو اپنی عنایتوں سے نوازتا رہا، لیکن ان کو دہلی کی یاد برابر ستاتی رہی،
اس کو وہ قبۃ الاسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کی پرشکوہ عمارتوں، محل سراؤں، تالابوں
مزاروں، باغوں کی خوشبوؤں اور یہاں کے حسینوں اور گلیوں کو یاد کرکے ملتان میں بے
چین ہو جاتے، ملتان سے دہلی سال میں ایک بار آتے، اور جب یہاں سے رخصت ہو جاتے
تو دہلی چھوڑتے وقت ان کو انتہائی شاق گذرتا[1]

بیرونی حملے پر اظہار تشویش

ملتان ہی کے قیام کے زمانے میں چنگیز خانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس موقع پر
خسرو کی وطنی محبت میں وسعت پیدا ہوتی نظر آتی ہے : دہلی کے بجائے اب پورے ہندوستان
کے جاں نثار بن کر ان بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے
ہیں جو ایک محب وطن کو کرنا چاہئے، ہندوستان پر چنگیز خانیوں کے حملے کو آسمانی بلا اور
نسل فتنہ قرار دیتے ہیں ۔

واقعہ است این یا بلا کز آسمان آمد پدید
آفت است این یا قیامت کز جہان آمد پدید
راہ زن شد فساد عالم وا و نسل فتنہ را
زفتہ کامسال در ہندوستان آمد پدید[2]

ہندوستانی فوج کی نبرد آزمائی پر اظہار مسرت

ستر دن میں ہندوستان کی فوج نے ان بیرونی دشمنوں کو پسپا کیا تو بہت خوش
ہوتے لکھتے ہیں ۔

کہ ہندوستانی سواروں کا دستہ باہر نکل کر ان دشمنوں کے خلاف کوہ قاف
بن کر کھڑا ہو گیا ۔

رخش بیرون راند بر عزم مصاف
راست کردہ لشکرے چون کوہ قاف
قاف تا قاف از الف بائے قلم
کردہ طغرائے شہنشاہی رقم[3]

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال قلمی نسخہ دار المصنفین [2] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی ص ۲۲۹ [3] شعر العجم جلد ۲ ص ۱۲۹ [4] آب حیات ص ۹۸
[5] ڈسکوری آف انڈیا ص ۵۸ ۔ ۲۵۷
[6] دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو دہلوی از وحید مرزا ص ۵۱ [7] وسط الحیوٰۃ علی گڑھ ایڈیشن، ص ۱۶۱ [8] ایضاً ص ۵۱ ۔

شعر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ان ہندوستانی سواروں کی تیزی اور حرکت سے شیر کے جسم پر بھی لرزہ طاری ہوگیا۔

جنبش تیزی سواران دلیر
لرزہ می افگند در اندام شیر[1]

ہندوستان کی فوج کی تلواروں کو کافر سوز کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔

ہندوستان را کہ رسد از لشکر کافر زیان
ازتیغ کافر سوز ما ہست آب اندر رسانی[2]

تاتاریوں کے حملے روکنے کے لئے ہندو مسلمان جس طرح ایک ہوگئے، اس یکجہتی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

ہر دو ں شد دو تے از سر ترک و ہندو
کہ ہندوستان با خراسان یکے شد[3]

تاتاریوں نے جب ہندو مسلمان پر حملہ کیا، لیکن وہ بری طرح پسپا ہوکر ان کی طرف بھاگے، تو لکھتے ہیں کہ وہ الوکی نحوس صورت کے ساتھ کلنگوں کی طرح صف آرا ہوئے، مگر بھاگے تو زیرہ زیرہ ہوکر رہ گئے۔

گرچہ درساتے معل تاتر بوم در روے توم
صف کشیدہ چوں کلنگاں از خراساں می رسد
لیک از دست گریز ار سر کسو ر گیر ساہ
زیرہ زیرہ می شود آنگہ کہ کہساں می رسد[4]

ہندوستان کی طرف سے شہزادہ محمد سلطان نے ان تاتاریوں کو جس طرح پسپا کیا، اس سے خوش ہوکر لکھتے ہیں کہ شہزادہ نے اپنی تلوار سے مورو ملخ کی چنگیز خانی فوج پر حملہ کیا، دشمن صرف فرار ہوئے بلکہ پیروں تلے چیونٹیوں کی طرح ہلاک ہوگئے۔

دست او بمسر برا ور گرد چنگیز خان زماں
چوں بعزم رزم سوئے لشکر آں کافر شود
لشکر بدسگالاں از لشکرہائے مور و ملخ
پاک سودہ زیر پا در وقت مردن پرشود[5]

ہندوستان کی فوج ان حملہ آوروں کے خلاف جس بہادری اور جواں مردی سے لڑی اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ان کے تیروں نے بہادروں کے ہاتھ پاؤں بیکار کرکے رکھ دیا، ان کے گرزوں نے پہلوانوں کو پسپا کرکے رکھ دیا، وہ شیروں کی طرح ہر طرف بڑھے اور دشمنوں کا ڈھیر لگا، یا زمین سے خون کا دریا ابلنے لگا، دنیا سے روشنی جاتی رہی ہلتوں کی ریت سے آہ و زاری بلند ہونے لگی اور قیامت کا سماں پیدا کیا۔

از سرنگ خنجر پہلو شگاف
پارہ می شد مرد را پہلو تے ناف
در طراق گرزہ پولاد دست
پہلوئے ہر پہلوانے می شکست

کشتہ می شد چوں زتیری آمدے
مست پہلوئے زہر سو پہلوے
سرکہ از تیغ کسے تو
مرگ برآب رواں می باخت گو
بر زمیں از خوں شدہ دریا پدید
روشنی گشتہ زعالم نا پدید
از معل ہر سو فغاں برخاستہ
رستخیز از جہاں برخاستہ[6]

ہندوستان کی فوج کی پسپائی پر اظہار غم

مگر ایسا موقع بھی آیا جب ہندوستان کی فوج ان چنگیز خانی دشمنوں سے پسپا ہوگئی، شہزادہ محمد سلطان اس تصادم میں شہید ہوا، اس سے متاثر ہوکر ایک بہت ہی پر درد مرثیہ لکھا جو سحر حلال کا درجہ رکھتا ہے اس پسپائی پر خود بھی خون کے آنسو بہائے اور جس طرح ہندوستان کے لوگ روئے اس کی بھی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ دو چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

چہرہ مہ بر روئے آں فرخ لقا گریستند
روز وصف ہر سال آں ملک لقا گریستند
آسمانہا بہاراں دیدہ براہل زمیں
ہمچو باراں بہاری بیکراں بگریستند
طفل ملماں مرد و زن گریہ کناں ونوکناں
کودکی وہ بیسوی دجا بجا بگریستند

ملک اور تاج وتخت کے دشمنوں سے اظہار نفرت

مذکورہ حملہ آوروں سے شدید نفرت پیدا ہوجاتی ہے امیر خسرو میں بھی یہی نفرت چنگیز خانیوں کے خلاف پیدا ہوئی، ان کی بہت ہی بری تصویر کھینچی ہے کہ ان کا سر گھٹا ہوا ہوتا، جس پر اون کے پر ہوتے، ان کا سر انڈے کی طرح دکھائی دیتا، ان کا چہرہ چوڑا چکلا ڈھال کی طرح معلوم ہوتا، آنکھیں ماتھے میں گھسی ہوئی ہوتیں، ناک چپٹی ہوتی، جس سے ریزش جاری رہتی، اور دانت کے مانند کی طرح دکھائی دیتیں، وہ چوہے کھاتے کتے کی طرح کھانے کی چیزوں کی طرف دوڑتے، میلے کچیلے بدبودار ہوتے، کوئی ان کے پاس بیٹھ جاتا، تو اس کو تے ہو جاتی، وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح ان مرغ طبیعت اور انسان دشمنی کے باوجود وہ ان لوگوں کا ذکر بہت ہی نفرت سے کرتے ہیں جو ملک یا تاج وتخت کے دشمن ہوئے، مثلاً سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں بنگال میں طغرل نے بغاوت کی، تو اس کے لئے خسرو نے ازم، سوم، سودائی بے دولت، اور نامبارک جیسے نامعقول اور نازیبا الفاظ لکھ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا، اور اس کی پسپائی پر خوش ہوئے۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر جو راجا یا باغی ہوتا

۱؎ ایضاً ص ۴۲۰ ۲؎ ایضاً ص ۱۲ ۔ ۳؎ بسط الحیوٰۃ علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۱ ۴؎ ایضاً ص ۸ ۵؎ ایضاً ص ۱۶۶ ۶؎ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں از راقم ص ۸

کے مخالف ہوتے، ان کے لئے بھی سخت سے سخت الفاظ استعمال کئے، جیسے ہیں، اکرات، سانپ اور روز ننگل کے باشندوں سے ملاطفت۔ دلی کی جنگ ہوتی تو ان کے خلاف ایسے ایسے ناخوش گوار الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد آج کل گرانی ہوتی ہے لیکن سب سے ہی وہ تخت و تاج کے وفادار ہو جاتے تو پھر ان کی ادا ان کے ہم مذہب ان کی مدح میں ان کا قلم طرب انگیز ہو جاتا۔ مثلاً ۱۳۱۱ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے ملک کافور کی نگرانی میں دھور سمندر میں ایک فوج بھیجی، تو دلنگ کے راجہ رائے رایان رام دیو نے شاہی لشکر کی ہر قسم کی مدد کی، امیر خسرو نے اس کی تعریف اصل واصل الاہ فکر کی ہے، ان کے بیان کے مطابق جب شاہی لشکر دھور سمندر جاتے وقت دیوگیر سے گذرا تو رام دیو نے پورے اخلاص سے شہر کو فردوس کی طرح آراستہ کیا اور حکم دیا کہ لشکر کی ضرورت کی تمام چیزیں بازار میں موجود رہیں، اگر شاہی لشکریوں کے چلوالوں کو اپنے ستوروں کے لئے سیمرغ کے پروں کی ضرورت ہو تو بھی فراہم کئے جائیں، پورے شہر کا بازار بھی ارم کی طرح سجایا گیا، جب شاہی لشکر کے سوار اس میں سے گذرے تو ان کو معلوم ہو رہا تھا کہ سب سبزہ زاروں میں سے گذر رہے ہیں، بازار کا ہر حصہ نئے انداز سے آراستہ کیا گیا تھا، صراف سونے اور چاندی کے سکے لئے بیٹھے تھے، بزازوں نے ہندوستان اور خراسان کے عمدہ کپڑوں کی دکانیں لگا رکھی تھیں، پھلوں کا انبار لگا ہوا تھا، ان میں سے بعض تو تاتار اور آرام سے زیادہ شیریں اور رسیلے، لشکریوں کے لئے اون، چمڑے، نیل اور لوہے کی ساری چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو بھی چاہے، مناسب قیمت پر خرید لے، عدل و انصاف ایسا تھا کہ

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے
نہ ہندو را مخالف بود رائے[1]

دھلی کی جدائی پر اظہار غم

امیر خسرو اپنے مربی شہزادہ محمد سلطان کی شہادت کے بعد ملتان سے دہلی آئے، تو دہلی دربار کے ایک ممتاز امیر حاتم خان جہان کے ندیم ہو گئے۔ وہ ان کو شاہی لشکر کے ساتھ اودھ لے گیا تو دلی چھوڑتے وقت وہ بہت روئے، اور راستہ بھر خون کے آنسو بہاتے رہے۔

بر عزم سفر عناں کشادم
خونابہ ز دیدگاں کشادم
با لشکر شاہ کوچ بر کوچ
در گریہ ہمی شدم بہر کوچ[2]

اودھ کی تعریف لیکن دھلی کے لئے بے چینی

اودھ یعنی اجودھیا میں وہ دو سال تک رہے، یہاں ان کو ہر قسم کی راحت میسر تھی، حاتم خان ان کو اپنی دولت سے نوازتا رہا، ان کے اصلی وطن پٹیالی سے اودھ قریب تھا، اس لئے اجودھیا کی ہر چیز ان کو بھلی معلوم ہوتی، وہ ایک خط میں بہت ہی طرب انگیز طریقہ سے لکھتے ہیں کہ یہ سرزمین سبزہ زار، مرغزار، انگور، انار، نشتر سے کھلے؛ مولسری، چمپا، جوہی، کیوڑا، صندل، عود، عنبر، مشک اور کافور سے بھری ہوئی ہے یہاں کے لوگ بھی ان کو خوش مزاج، خوش اطوار، خوش گفتار اور خوش معاملہ معلوم ہوئے لیکن ان کا دل دلی کے لئے تڑپتا رہا، دلی سے دوری اور یہاں کے دوستوں کی جدائی سے ان پر جو گزر رہی تھی، اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

دل سوختہ چوں چراغ کشتہ
صد جائے درونہ داغ گشتہ
در سینہ ز ہجر احباب شور
آبے ز ہزار پیر دل دور
دل زندہ و تن ہلاک ماندہ
جاں بر سر ہلاک ماندہ[3]

جب ان کو وہاں سے دہلی جانے کی اجازت ملی تو لکھتے ہیں۔ جیسے ہی شوق میں کر دلی کی طرف چل کھڑے ہوتے، ایک تیر پیکاں کی طرح راستہ طے کیا، بلکہ تیر کی طرح اڑتے نظر آتے، ایک ہفتہ کے سفر میں گھوڑے کی لگام کو برابر پکڑے رہے، ہلال عید کی طرح دلی مسرور اور شاداں پہنچے، تو چمن کے گلاب کی طرح ہنس رہے تھے، دوستوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی، ان کے دیدار کا جام پی کر سیراب ہوتے، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ جو ان زندہ بر زندہ اپنے باغ میں پہنچ گیا ہے، ایک پیاسا آب حیات کے چشمہ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ مر کر پھر زندہ ہو گئے ہیں، مہربان ماں کے قدموں سے آنکھیں ملیں، جدائی سے جب ماں نے بھی اشکبار آنکھوں میں ساتھ اپنے سینے سے لگایا، اس وطنی محبت کی کیفیت ذرا ان کے اپنے الفاظ میں بھی سنئے۔

قطع کناں راہ چوں پیکان تیر
تک چو تیر آمدہ اندر گریز
یک مہ کامل نہ کشیدم عناں
راہ چنیں بود و کشش آں چناں
ہمچو مہ عید خوش و شاد بہر
در مہ ذی العید رسیدم بشہر
خندہ زناں ہمچو گل و بوستاں
چشم کشادم برخ دوستاں
یافتم از لذت دیدار کام
در مے مقصود شدم سیر جام
مرغ خزاں دیدہ بہ بستاں رسید
تشنہ بسرچشمۂ حیواں رسید
مردہ دل از جاں ز تن ساں خویش
زندہ شد از دیدن خویشان خویش

---

[1] خزائن الفتوح، علی گڑھ اڈیشن ص ۱۲۵ ۔ [2] دیباچہ قران السعدین ص ۱ ۔ [3] دیباچہ مثنوی قران السعدین ص ۱۱ ۔

اس کا اظہار اس طرح کیا ہے ۔

کم شود بہ مرا خراب و مست
از مئے سحگاں پاک زادہ
بوسہ ستاں ہوئے مرغول
خسرو چو شکست در ملا دہ[1]

خسرو کی جو مذہبی اور پاکباز زندگی رہی اس سے کبھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے وہ شراب پلانے والے لڑکوں کے عشق میں خراب و سرمست اور پیچ دار زلف رکھنے والوں کے پیچھے دیوانہ وار پھرتے رہے، یہ ان کی ایک غزل کے اشعار ہیں جو قران السعدین کی مثنوی میں نغمہ ترنم اور موسیقیت پیدا کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن اس شعرانہ رنگ میں وہ اس محبت کا اظہار کر گئے ہیں جو وہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ رکھتے تھے، پس ان کی طرف سے ہندوستان کے لئے پیام ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی رواداری اور مزاج دلی میں ہندوؤں کے کیا ہو سکتا ہے

خسرو دہلی کے شاہزادگان تاک زادہ کے لئے شراب و سرمست ہو سکتے تھے، تو پھر دہلی کے شاہی محلوں کے لئے ان کے محبت کس جذبات کیوں نہیں پیدا ہوتے، ان کے عہد میں کیلوکھری میں ایک محل قصر نو کے نام سے تعمیر ہوا، اس کی مدح میں بکثرت اشعار کہے گئے ہیں، ایک شعر میں کہتے ہیں کہ یہ محل کا ہے کو ہے، ایک بہشت ہے جس کے روزن اور برج پر طوبیٰ کی شاخ چھائی ہوئی ہے ۔

قصر نگویم کہ بہشتے فراخ
روضہ طوبیٰ در او را نہ شاخ[2]

ایک دوسرے شعر میں اسے پرواز تخیل کے ساتھ رقم طراز ہیں کہ اس کے گنبد کی بلندی آفتاب کے لئے سعد ارض گئی ہے ۔

بام سعدش بہ فلک سر و سر
گرد کمر سعد سے اکبر[3]

اس محل کے پیچھے جو ماہی تھی، ایک شاعر ہی یہ دل آویز نکتہ پیدا کر سکتا ہے کہ اس کا ہپاپانی محل جیسے عروس کے لئے آئینہ کا کام دیتا ہے ۔

طرفہ عروسے شدہ آراستہ
آئینہ از آب رواں خواستہ[4]

دربار میں جشن نوروز میں جو چہل پہل ہوتی تھی، یا اس موقع پر چتر سیاہ، چتر سعد، چتر سرخ، چتر سبز، چتر گل، رایت لعل و سیاہ، گلستان سیم و زر، محل موم اور دستہ گل دل فریب سے دربار کی جو زیب و آرائش کی جاتی تھی اس کی مصوری اس مثنوی میں خسرو نے اپنا شاعرانہ آرٹ دکھا کر جو یہ کہا ہے کہ ۔

قصر ہمایوں ز زمیں تا سماک
زیور زرلہ جو فردوس پاک[5]

اس سے ان کے ان اندرونی جذبات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے وطن کے دربار کی زینت و آرائش کا مقابلہ ایران، توران اور خراسان وغیرہ کے درباروں سے نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا موازنہ صرف فردوس پاک سے ہو سکتا ہے ۔

قران السعدین میں موضوع کی بڑی رنگارنگی ہے، اس میں خسرو کا قلم مختلف مضمون میں چلتا رہا، جہاں ان کو موقع ملا، دہلی یا دہلی کی کسی چیز کی تعریف کرنے لگے ہیں، کسی نہ کسی صورت سے ہندوستان کے تربوزے کا ذکر لے آئے ہیں، یہ ان کے وطن کا پھل تھا، اس لئے دل کھول کر اس کی تعریف کی کہ یہ بہشت کے تمام میووں سے بازی لے گیا ہے اس میں قند کی ایسی مٹھاس ہے، اور آب حیات کی ایسی تاثیر ہے

خربزہ گوئی کہ زصحرائے کشت
گشتہ زلود از گرہ ستہ بہشت
از مرہ گرد آمدہ دردے ماب
جام شکر ریختہ جو آب حیات[6]

بغرا خان اور کیقباد کی ملاقات کے وقت دونوں میں بڑے قیمتی تحائف کا مبادلہ ہوا، جس میں عود، مشک، عنبر، کافور، زر و جواہرات، موتی، یاقوت، گھوڑے، اونٹ، اسلحہ، طاقی، غلام اور حریر و پرنیان وغیرہ سب کچھ تھے، مگر خسرو کی نظر ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے کی طرف اٹھی، جس کو وہ جامہ ہندی کہتے ہیں، اس کی تعریف یہ لکھی ہے کہ یہ اتنا باریک تھا کہ جیسے جسم ابھر آتا تھا، بعض کپڑے ایسے تھے کہ ان کو چھوؤ تو انگلیوں کے ناخن میں آجائیں، اور کھولو تو دنیا کو ڈھک لیں ۔

جامہ ہندی کہ بدا سد نام
کرسنگی یں نہ سماید تمام
مانده بہ پیچیده بہ ناخن نہاں
بازکشائی بہ نوشد جہاں[7]

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی ضیافت کی، دعوتیں کیں، ان کی تفصیل بھی خسرو نے بڑے طمطراق سے بیان کی ہے، دسترخوان پر ایک ہزار سے زیادہ قسموں کی نعمتیں ہوتیں، ان کو مزے لے لے کر بیان کرنے میں خسرو کا وطنی جذبہ ابھرا ہے کہ اور ملکوں میں ایسی نعمتیں میسر نہیں، ان دعوتوں میں پان بھی تقسیم ہوا، یہ خسرو کے وطن کی خاص چیز تھی، اس لئے اس کی تعریف میں ان کا قلم مشکل سے رکا، جہاں اس کی سب کچھ مدح سرائی کی ہے وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی نعمت ہے، یہ دیکھنے میں تو ایک گھاس ہے لیکن اس سے خون پیدا ہوتا ہے، منہ کی بدبو کو دور کرتا ہے، کمزور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے، سیر ہو کر کھانے والوں کی بھوک بڑھاتا ہے اور بھوکوں کی بھوک میں کمی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ[8]

ہندوستان کے ارباب علم کی تعریف

امیر خسرو کے سن کی پختگی کے ساتھ ان کی وطنیت اور بھی راسخ ہو گئی، وہ جب چالیس سال کے تھے تو اپنے کلام کا تیسرا مجموعہ ۶۹۳ھ میں غرۃ الکمال کے نام سے مرتب کیا اس کا ایک طویل دیباچہ نثر میں لکھا ہے جس میں اور بہت سی باتیں لکھنے کے ساتھ

---

۱ ایضاً ص ۳۷ ۲ ایضاً ص ۴۵ ۳ ایضاً ص ۴۵ ۴ ایضاً ص ۵۵ ۵ ایضاً ص ۸۲ ۶ قران السعدین علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۹ ۷ ایضاً ص ۱۲۲ ۸ ایضاً ص ۸۶-۱۸۵ ۔

ہو نہیں جاتی۔

رنویش جانہ خوباں معطر
دو سالہ مشک و بوئے ریحان[1]

رائے چمپا کو پھولوں کا بادشاہ قرار دیا ہے، کہتے ہیں کہ اس کی خوشبو ایسی ہے جیسے سراب میں کسی نے مشک ملا دیا ہے، چمپلی جیسے بدن والے معشوق کی طرح مہکتا ہے، اس میں زردی عاشقوں کے چہرے کی طرح ہوتی ہے۔

دگر آں رائے چمپہ ساہ گلہا
کہ بوئے مشک بار آمد چو لیلیٰ[2]
چو معشوق سمن بر ناز پرورد
ولے رنگش چو روئے عاشقاں زرد

مولسری کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی طرف عام لوگوں کا دل مائل ہے اس کے پھول معشوقوں کی گردن کے حمائل ہیں۔

بہ مولسری دلہا گشتہ مائل
شدہ در گردن خوباں حمائل[3]

کیوڑی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بھونرا اس کے لئے جان دیتی ہے، مرنے کے بعد بھی اس سے لپٹی رہتی ہے، معشوق عاشق کی طرح اس کے لئے سرگرداں رہتی ہے، یہ پھولوں کے معشوقوں کا معشوق ہے۔

زعشق بوئے او جاں دادہ زنبور
نگشتہ بعد مردن زو ازو دور
ہمہ خوبانش عاشق دار خوباں
کہ معشوقیست از خوبرویاں[4]

اسی طرح اور دوسرے پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ... یہ پھول کھلتے ہیں اور کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں ان گھٹاؤں میں سے جب ترشح ہوتا ہے تو ان پھولوں کا باغ فردوس کا باغ معلوم ہوتا ہے، بلکہ فردوس میں بھی ایسا خوشگوار منظر ہوتا ہوگا، آخر میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے ایسے پھول اگر روم و شام میں ہوتے تو وہاں کے لوگ ان کی تعریف دنیا بھر میں کرتے پھرتے[5]

ہندوستان کے حسن کی تعریف

امیر خسرو کو جس طرح ہندوستان کے پھول دوسرے ملکوں کے پھولوں سے بہتر نظر آئے اسی طرح ان کی نظر میں ہندوستان کے معاملہ میں کسی اور جگہ کا حسن بالکل نہیں جچا، انہوں نے تمام بین الاقوامی حسن کو اس میں کچھ نہ کچھ نقص نکال کر رد کر دیا تھا، اس زمانہ میں ان کی نظر میں مصر، روس، تاتار، قندھار، سمرقند، ختن، چلچ اور یغما کے حسن پر پڑی ... ان میں روایتی طور پر چلچ اور یغما کا حسن زیادہ مشہور تھا، مگر خسرو کو ان جگہوں کا بھی حسن پسند نہ آیا کیونکہ ان کے قول کے مطابق ان کے حسین بد چشم اور ترش رو ہوئے، خراساں کا حسن بھی مشہور تھا کیونکہ ان کے چہرے پر سرخی اور سپیدی ملی ہوتی، مگر خسرو کو ہندوستان کے معاملہ میں خراساں کی ہر چیز ناپسند تھی، اس لئے ان کے سرخ اور سپید رنگ کے حسینوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ ان کے جیسے پھول ہوتے ہیں ویسے حسین بھی ہوا کرتے ہیں یعنی رنگ ہے لیکن خوشبو یعنی دل آویزی نہیں، ان کو روم و روس کا حسن بھی پسند نہیں تھا کیونکہ ان کے معیار کے مطابق ان میں ناز و انکسار نہیں ہوتا، پھر ان کے خیال کے مطابق یہاں کے حسین برف کی طرح سرد ہوتے، ان کی آنکھیں چھوٹی اور ناکیں پست ہوتیں وہ تاتاری حسینوں کو ناپسند کرتے کیونکہ ان کے لبوں پر ہنسی نہیں دکھائی دیتی، وہ مصر کے حسینوں کو بھی لائق توجہ اس لئے نہیں قرار دیتے کہ ان کے چہرے پر نمک نہیں ہوتا، سمرقند اور قندھار کے حسن میں ان کو شیرینی محسوس نہیں ہوتی، اس طرح مصر اور روم کے سیمیں بدن حسینوں میں چستی و چالاکی نہیں پاتے جو چیزیں ان بیرونی ممالک کے حسینوں میں نہیں پائی جاتیں، وہ خسرو کو ہندوستان کے حسن میں دکھائی دیتیں، یعنی غمزہ و انکسار بھی، لبوں پر تبسم بھی، چہرے پر نمک بھی، شیرینی بھی، اداؤں میں چستی اور چالاکی بھی اس لئے بے اختیار یہ اعتراف کرتے ہیں۔

بتان ہند را سبب ملاحت ...
ہر یک ... بتان ہند ملک ملاحت[6]

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خسرو لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے حسینوں میں ہر قسم کا رنگ پایا جاتا ہے، اس کی شاعرانہ تاویل بھی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے، لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے حسینوں کے تین رنگ ہوتے ہیں سیاہ، گندمی اور سپید، سیاہ رنگ کی خوبی بیان کرنا دشوار ہے، مگر اس میں یہ کہہ کر حسن پیدا کر دی ہے کہ آنکھوں کی پتلی تو سیاہ ہی ہوتی ہے، اور اس میں آدمی تو سیاہ ہی نظر آتا ہے، اور ہر پتلی کے لئے سرمہ چاہئے، سرمہ کا رنگ تو سیاہ ہی ہوتا ہے، سپید رنگ تو عارضی ہوتا ہے، اس لئے بے سود ہے۔

سیہ را خود مدیدہ جائے گاہ است
کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است[7]
ز بہر دیدہ باید سرمہ را سود
سپیدہ عارضی رنگی است بے سود

گندمی رنگ کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت آدم نے گندم ہی کو پسند کیا اور پھر اسی گندم سے سارا فتنہ اٹھا، اگر گندم کے آٹے کے ساتھ نمک ملا دیا جاتا ہے تو سینکڑوں بے نمک سپید نکوں سے بہتر ہو جاتا ہے، خسرو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گندمی رنگ کے ساتھ چہرے پر نمک بھی ہو تو چہرے کی سپیدی سے کہیں بہتر رنگ ہوتا ہے۔

بگندم گوست میل آدمی را
کہ ایں فتنہ ز آدم یافت میاد
یکے گندم بہ کام اندر نمک دہ
ز صد قرص سپید بے نمک بہ[8]

خسرو کو ہندوستان کے حسینوں کا سبزہ رنگ بہت پسند تھا اسی لئے اس رنگ کی تعریف میں ان کا قلم خوب چلا ہے، کہتے ہیں کہ یہ سبز رنگ لالہ و نسرین کے رنگ سے بہتر ہوتا ہے بہشت کے طاؤس کا رنگ بھی یہی ہے، ستاروں کی رسن بھی اسی رنگ سے ہے، بہشتیوں کی پوشاک کا بھی یہی رنگ ہے، بہار کا رنگ بھی اسی رنگ سے ہے، وغیرہ وغیرہ یہ تو ہندوستان کے حسینوں کے رنگ کی مدح سرائی ہوئی، خسرو کے عہد میں تو تہذیب تھی اس لحاظ سے وہ کسی شریف یا پردہ نشین عورت کی قلمی تصویر کھینچنا معیوب تھا، لیکن حسن کی پسندیدگی میں ہندوستانی دوشیزاؤں کی نمائندگی ان ہندوستانی رقاصاؤں کی مرقع آرائی کر کے کی ہے جو شہزادہ خضر خاں کی شادی کے موقع پر بلائی گئی تھیں یہ طبقہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، مگر ان ہی کے ذریعہ شعرا نے ہندوستانی حسن و عشق کی جاذبی داستان مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، خسرو نے ان حسینوں کو اپنے قارئین کی خیالی آنکھوں کے سامنے لا کر جو کھڑا کر رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ہندوستان کے حسن کا کیا معیار تھا ذرا دیکھئے ان کے مژگاں سے سینے چھلنی ہو جائیں، ان کی دزدیدہ نگاہوں سے عمر جاتا رہے، ان کے کرشمے سے روح نکل پڑے، وہ پلکیں ایسی کہ نوجوان ہلاک ہو جائیں، ان کی ہنسی سے عاشق لمعہ ہو کر رہ جائیں ان کے تل موتی کی ڈبیا کی طرح ہوں، ان کے ابرو کی کمان پر جانیں قربان ہوں، ان کے گیسوؤں میں ایسے پیچ و خم ہوں کہ معلوم ہو کہ سانپ صندل میں لپٹا ہوا ہے ان کی زلفوں کے خیال میں وہی کیفیت پیدا ہو جو روزہ داروں کی شام میں ہوا کرتی ہے، ان کی نیم خواب اور نیم بیدار آنکھوں کو دیکھ کر نیند حرام ہو جائے، ان کے دہن غنچہ کی طرح کبھی شگفتہ ہوں، ان کے زنخداں سیب کی طرح ہوں، اگر ان سے پسینہ ٹپکے تو پسینہ میں ان کے انار دانے اگے ہوئے دیکھے جائیں، یہ تو راقم کے الفاظ ہوئے، اب ذرا خسرو کے اشعار سے بھی محظوظ ہوں۔

به مژگانے که صد سینه سفته
چه غم دارد مرا دزدیده گفته
بهر چشمک زدن کشته هزارے
بهر خنده زدن بربوده جانے
ز خال چون شده بر درج مرجان
یکے گوهر نهاده رخ صد جان
ز ابرو آنکه بر آن گشته جانها
دو چوگان فگنده در قربان کمانها
دو گیسو گرد سر یک پیچ کرده
چو مارے گرد صندل پیچ خورده
خیال زلف شان در جان یاران
چو شام اندر خیال روزه داران
ربوده خواب بیداران یکبار
ز چشم نیم خواب و نیم بیدار

دهن‌ها چو غنچه گاه گفتن
گهے در بستن و گه در شگفتن
زنخ‌ها چون سیب لعل گونه
نه چون سیب دو رنگ ارمن گونه
عرق کز روے بر طارمی رست
کز تنه می چکد دانه می رست[1]

ہندوستان کے مراسم پر اظہار مسرت

شہزادہ خضر خاں کی شادی کے موقع پر شہر کی پوری آرائش کی گئی در و دیوار پر تصویریں سجائی گئیں۔ راستوں پر دیبا کے فرش بچھائے گئے نوبت اور شادیانے بجائے اور ڈھول بجائے گئے نٹوں نے رسیوں پر تماشے دکھائے، شعبدہ بازوں نے طرح طرح کی شعبدہ بازیاں کیں، بہروپیوں نے سوانگ بھرے، رقاصاؤں نے رقص و سرود سے تماشائیوں کو محظوظ کیا، نجومیوں نے ساعت سعد مقرر کی، تو بارات ہاتھی گھوڑے اور لشکروں کے جلو میں روانہ ہوئی، راستہ میں یاقوت اور موتی لٹائے گئے نکاح نیک ساعت میں پڑھا گیا تو دولہا پر موتی بکھیرے گئے۔ دولہا دولہن کے گھر پہنچا تو دولہن کو اس کے سامنے لا کر جلوہ دکھلانے کی رسم ادا کی گئی وغیرہ وغیرہ[2] ان سب مراسم میں ہندوستانی اثرات زیادہ نمایاں تھے، جن کو خسرو نے مزے لے لے کر ظاہر کرنے کے لئے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں جو ہندوستانی تہذیب سرایت کر رہی تھی اس سے وہ خود خوش تھے۔

مذہبی عقائد کا احترام

وطنی محبت کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ وطن کی سرزمین میں جتنے لوگ رہتے ہوں ان سے بھی مذہب، عقیدہ، ذات پات کی تفریق کے بغیر محبت کی جائے، اور ان کے مذہبی عقائد کا احترام بھی برقرار رکھا جائے خسرو کے یہاں اس کا بھی پیام ملتا ہے مثلاً اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں ایک آتش پرست ہندو کا ذکر لے آتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے اور اس کے لئے جان کیوں دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں ہوتی رہتی ہے اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے۔[3]

محبت میں ایمانی جذبہ وطنی

امیر خسرو نے قطب الدین مبارک خلجی کی فرمائش پر اپنی مثنوی نہ سپہر ۱۳۱۸ء میں لکھنی شروع کی، اس میں وہ اپنے شاہی آقا کی تخت نشینی، اور اس کی لشکر کشی وغیرہ کا حال لکھنا چاہتے تھے مگر ان کے جو وطنی جذبات دبے ہوئے تھے وہ اس مثنوی میں بہت زیادہ ابھر کر سامنے آگئے ہیں، اگر قران السعدین کو مثنوی وصف دہلی کہا جا سکتا

[1] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۵۹ - ۱۵۸ [2] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۱۵۱-۱۵۲ [3] ایضاً ص ۹۶-۱۹۵۔

ہے تو یہ سپہر کو مثنوی نہ صرف ہندوستان کہا جا سکتا ہے، اس میں تو وہ اپنی وطنیت کے اظہار میں بالکل محو اور سرشار ہو گئے ہیں اسی سرمستی میں کہہ اٹھے ہیں ۔

حکمت و دانائی و علم و ہنر
وانچہ کہ در ہند معاینست دگر[1]

پھر اپنی وطنیت کو مذہبی رنگ یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس سے ضرور محبت کرتے ہیں، اور سبب محبت کرتے ہیں اس لئے کہ یہ ان کا مولد، مادی اور وطن ہے اور ان کے رسول کی تعلیم ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جز ہے ۔

آنست یکے کیں زمیں از دور من
ہست مرا مولد و مادی و وطن
وان ز رسول آمدہ کامی زہرہ دیں
حب وطن ہست ز ایمان یقین[2]

ہندوستان جنت ارضی ہے

اسی کے بعد یہ لکھتے ہیں ۔

کشور ہند است بہشتی زمین[3]

اس کے ثبوت میں سات اسباب فراہم کئے ہیں۔[4] ممکن ہے کہ ان اسباب میں ازمنہ وسطیٰ کا طرز استدلال دکھائی دے، جو موجودہ دور کے ذہن کے لئے زیادہ قابل قبول نہ سمجھا جائے، مگر خسرو نے جس جذبہ اور جس جوش و خروش کے ساتھ ان اسباب کو معلوم کیا ہے وہ قابل قدر ہے پہلے چار اسباب تو یہ بتاتے ہیں کہ حضرت آدم جنت سے ہندوستان میں آئے یہاں طاؤس جیسا فردوس کا پرندہ ہوتا ہے، یہاں سانپ بھی باغ فلک سے آیا حضرت آدم ہند سے باہر نکلے تو فردوس کی نعمتوں سے محروم ہو گئے، اس کے بعد خسرو نے اور دو اسباب بتاتے ہیں، ان میں بڑا اعتدالی رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس سے آج کل کے اعتبار سے کبھی تسکین ہو سکتی ہے، لکھتے ہیں کہ یہاں خوشی اور عیش کے ساتھ اس کے پھول اور مٹی میں طرب آگیں ہے جس سے نشاط و آسائش کا سامان مہیا ہوتا رہتا ہے، یہاں کے پھولوں اور خوشبوؤں کی وجہ سے سال کے ہر حصہ میں اس کی سرزمین گلزار بنی رہتی ہے، اور روم میں تو پھول دو تین مہینے سے زیادہ نہیں دکھائی دیتے اور وہاں جو پھول ہوتے بھی ہیں تو برف اور ژالہ کی وجہ سے ان میں خوشبو نہیں ہوتی، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان اپنی نعمتوں اور خوبیوں کی وجہ سے بہشت ہے ۔

خوش دلی و عیش فراست جنان
کان زمی از روح شدہ دار جنان[5]
بس ہمہ حال زگل و سبزی
ہند بہشت است با تبانی زمی[6]

آخر میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موت کے بعد ان کو جنت ملے گی، اس لئے وہ اس دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہیں لیکن ہندوستان میں خوش نصیبی ہے اس سے ہندوستان خود بخود جنت بن گیا ہے اور ہندوستان کے مسلمان اس سرزمین کو قید خانہ کے بجائے جنت سمجھنے لگے ہیں ۔

گرچہ کہ در سبب فردوس جہان
ماہمہ لطیفش خور بدان است جہان
لیک ہند است بہشتش دگر
کاندرون می دہد از حسن اثر
زان سبب خاص مر اصحاب یقین
ہند نوان گفت کہ خلد ست زمین[7]

ہندوستان کی آب و ہوا کی خوبیاں

قران السعدین میں خسرو نے مختصر طور پر ہندوستان اور دہلی کی آب و ہوا کی تعریف کی تھی[8] ان کو شاید اس اختصار سے تسکین نہیں ہوئی، اس لئے نہ سپہر میں ہندوستان کی آب و ہوا کی پھر مدح شروع کر دی ہے، وہ کوئی ماہر موسمیات تو نہیں تھے، محض شاعر تھے، اسی لئے شاعرانہ انداز میں اس کی دس خوبیاں بتا کر اس کو دوسرے ممالک کی آب و ہوا سے بہتر قرار دیا ہے،[9] پہلی خوبی تو یہ بتائی ہے کہ یہاں کی سردی سے کسی آدمی کو نقصان نہیں پہنچتا، ہندوستان کی فضیلت بیان کرنے میں خراسان کو ہمیشہ نیچا دکھاتے ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں دوسری خوبی یہ بتاتے ہیں کہ خراسان میں لوگ ٹھنڈک سے مر جاتے ہیں مگر ہندوستان میں سردی سے لوگ ہلاک نہیں ہوتے، تیسری خوبی یہ لکھی ہے کہ یہاں کی سرد ہوا کے خوف سے غریبوں کو زیادہ سرمائی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی ایک کمبل کافی ہوتا ہے، کسان تو ایک پرانی چادر میں رات گذار لیتا ہے، برہمن تو رات کے آخری حصہ میں جمنا کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگاتے ہیں، خسرو کے نزدیک چوتھی خوبی یہ ہے کہ خراسان میں دو تین مہینے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہندوستان میں پورے سال گل و گل کی بہار رہتی ہے، یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے یہاں کے پھول گل لالہ کی طرح خوش رنگ رہتے ہیں، اور یہاں کے پھولوں میں خشک ہونے کے بعد بھی خوشبو رہتی ہے، خسرو کے نزدیک پانچویں اور چھٹی خوبیاں ہیں، پھر یہاں کی آب و ہوا ہی کی وجہ سے امرود، آم، کیلا، الائچی، کافور، لونگ جیسی چیزیں ہوتی ہیں، اس کو وہ ساتویں خوبی قرار دیتے ہیں، ایک بار پھر وہ خراسان اور ہندوستان کا موازنہ کرنے لگتے ہیں، کہتے ہیں کہ خراسان کے بہت سے میوے تو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں لیکن ہندوستان کے میوے وہاں نہیں ہوتے اس کو وہ آٹھویں خوبی بتاتے ہیں، بعد دو خوبیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے دو نادر چیزیں ہوتی ہیں، ایک کیلا اور دوسرا پان، کیلا تو اب ہندوستان سے باہر بھی ہونے

---

[1] مثنوی نہ سپہر مسلم یونیورسٹی ایڈیشن ص ۱۴۹ ۔ [2] مثنوی نہ سپہر مسلم یونیورسٹی ایڈیشن ص ۱۵۰ [3] ایضاً ص ۱۵۱ ۔ [4] ایضاً ص ۱۵۷ ۔۱۵۱ [5] ایضاً ص ۱۵۵ [6] ایضاً ص ۱۵۷ [7] ایضاً ص ۱۶۰ [8] ایضاً ص ۱۶۱ ۔

لگا ہے، لیکن پان کہیں اور نہیں ہوتا ہے، اس کو وہ میوہ ہی قرار دیتے ہیں۔

بست۔ ہم آنکہ چو تنبول کُرَن
میوہ نہ ماتند ہمہ روئے زمین

ہندوؤں کے علوم و فنون کی تعریف

یہاں تو خسرو نے اپنے وطن کی آب و ہوا کی خوبیاں بتائیں، وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے وطنی بھائیوں کے علوم و فنون کی قدر کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔[1] اسی لئے بڑی فراخ دلی سے لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں کے دانش و معانی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، روم سے فلسفہ ضرور پھیلا لیکن ہندوؤں کے یہاں بھی یہ علم کم نہیں، یہاں منطق بھی ہے، نجوم بھی، علم کلام بھی البتہ ان کے یہاں فقہ نہیں، برہمنوں کے علم کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے۔

برہمنے ہست کہ در علم و خرد
دفتر قانون ارسطو بدرد

خسرو کے بیان کے مطابق ہندوستان میں طبیعات، ریاضیات اور ہیئت وغیرہ سب کچھ ہیں، البتہ یہاں کے لوگ مابعد الطبیعاتی علوم نہیں جانتے، خسرو کے اس بیان کے آخری ٹکڑے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، گو خسرو نے یہ لکھ کر اس کو یہ کہہ کر سنبھالا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ اور بھی قومیں مابعد الطبیعاتی علوم سے واقف نہیں۔

ہندوؤں کی وحدانیت کا اعتراف

اس کے بعد خسرو نے ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی اہم ہے، مسلمانوں کے یہاں توحید ایمان کا سب سے بڑا جز ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل نہیں ان کو وہ مذہبی حیثیت سے اونچا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں، وہ ہندوؤں کو محض بت پرست سمجھتے رہے ہیں، خسرو ہندو و مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو یہ کہہ کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندو ہمارے مذہب کے تو معتقد نہیں لیکن ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں، لکھتے ہیں کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ہستی، وحدت اور قدم کے معترف ہیں۔ وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ وہی عدم سے اس دنیا کو وجود میں لایا، وہی روزی عطا کرتا ہے، وہی نیکی اور بدی کا خالق ہے، اس کی حکمت ازلی و ابدی ہے، وہی ازل سے ہر کل و جز کا مختار اور فاعل ہے، یہ ساری باتیں تحقیق کر کے لکھی جا رہی ہیں، ان میں جھوٹ نہیں۔

معترف وحدت و ہستی و قدم
قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم

رازق ہر ہر ہمہ سر بہ ہمہ سے
عمر دہندہ ہر جانور سے
خالق افعال نہ نیکی و بدی
حکمت و حکمتش ازلی و ابدی
عامل ہمہ اعمال و مختاری عمل
عالم ہر کل و جزوی ز ازل
این ہمہ را گشت بہ تحقیق مقر
نے چو سے طائفہ بر کدب مقر

ہندو مذہب کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے

اسی پر وہ اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ ہندوؤں کے مذہب کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے بھی کرتے ہیں، انھوں نے اس مذہب کو اسلام کے علاوہ اور تمام مذاہب سے بہتر قرار دیا ہے لکھتے ہیں کہ ثنوی فرقہ خدا کو ایک نہیں مانتے بلکہ دو مانتے ہیں، لیکن ہندو خدا کو ایک ہی مانتے ہیں، عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں ہندوؤں کا یہ عقیدہ نہیں، فرقہ مجسمہ خدا کو صاحب جسم مانتا ہے، ہندو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے، ستارہ پرست کی طرح ہندو سیارے خدا نہیں مانتے، فرقہ مشبہ خدا کو مخلوقات سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن ہندو اس کے خلاف ہیں، پارسی نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں، لیکن ہندوؤں کا ایسا خیال نہیں، وہ پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں لیکن ان کی پرستش میں جو اخلاص ہے وہ قابل قدر ہے، ان کو پوجنے کے باوجود وہ اس کے قائل ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوقات ہیں، وہ اس کی اطاعت کے منکر نہیں۔[2] ہندوؤں کی بت پرستی کے متعلق خسرو کا یہ شعر تو بہت مشہور ہوا۔

اے کہ ز بت طعنہ بہ ہندو بری
ہم ز وے آموز پرستش گری

ہندوستان کی فضیلت

ہندوستان کی فضیلت بیان کرنے میں خسرو کا قلم چلا تو رکا نہیں، اسی لئے ایک دوسرے انداز میں اس کی برتری بتانا شروع کر دیا ہے، اس کی فضیلت کے دس اسباب بتائے ہیں۔[3] مثلاً یہاں علم اور جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ رہا، یہاں کے لوگ دوسری جگہوں کی زبان سیکھ کر بول سکتے ہیں، مگر دوسری جگہ کے لوگوں کی زبان یہاں کی زبان بولنے میں بند ہو جاتی ہے، دوسرے ممالک کے لوگ یہاں کے علوم سیکھنے کے لئے آئے، مگر ہندوستان کے لوگ علوم سیکھنے کے لئے کہیں اور نہیں گئے، ہندسہ، ریاضی اور ایجاد صفر یہاں کی خاص چیزیں ہیں، کلیلہ و دمنہ جیسی کتاب کہیں اور نہیں لکھی گئی، شطرنج یہیں کی ایجاد ہے، کلیلہ و دمنہ اور شطرنج

---

[1] مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۶۱ [2] ایضاً ص ۱۶۲ - ۱۶۱ [3] ایضاً ص ۱۶۲ [4] ایضاً ص ۱۶۳ - [5] مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۶۵ [6] ایضاً ص ۱۶۲ - ۱۶۹ -

کی مقبولیت و شناس ہوئی، یہاں کی برتری کو برقرار رکھنے میں یہاں کی موسیقی کو بھی بڑا دخل ہے، یہاں کی موسیقی کو جو ترقی ہوئی وہ کہیں اور نہیں ہوئی، یہاں کی موسیقی سے جنگل کے ہرن بھی بے جان ہو جاتے ہیں، آخر میں خسرو ہندوستان کی فضیلت میں بھی اپنے کو شمار کرتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ اس کا جیسا ساحر شاعر جو ہرج کہہ سکے کہیں اور نہیں پیدا کیا

محنت وہ آنکہ چو خسرو بہ سخن
سحرگری مست نہ چرخ کہن

زبانوں میں سنسکرت کی برتری کا اعتراف

اپنی وطن دوستی میں یہاں کی مختلف زبانوں میں عربی، فارسی، اور ترکی کے علاوہ سندھی، لاہوری، کشمیری، کبری، دھور سمندری، تلنگی، گجری، معبری، گوری، بنگالی، اودھی اور سنسکرت کا بھی ذکر کرتے ہیں،[۱] لیکن ان سب میں سنسکرت کو افضل بلکہ فارسی سے بھی برتر قرار دیا ہے، البتہ عربی سے اس کو بہتر نہیں سمجھتے ہیں، مگر اس کی برتری کو فارسی کے برابر ہی تسلیم کیا ہے۔

آسے ربالے رفعت در دری
از عربی کمتر و برتر زدری
گرچہ کہ بیتر ہست در ہر دو نگرین
ذوق عبارت کم ازاں ہست دریں[۲]

ہندوستانی جانوروں کی تعریف

امیر خسرو کو ہندوستان کی ہر چیز پیاری رہی، تو پھر یہاں کے جانوروں کی طرف ان کی پیاری نگاہیں کیوں نہ جاتیں، ان کے اوصاف بیان کرنے میں بھی ان کے وطنی جذبات خوب ابھرے ہیں،[۳] لکھتے ہیں کہ یہاں کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں، مینا یہاں کا خاص پرندہ ہے جو کہیں اور نہیں پایا جاتا، یہ بھی آدمی کی طرح بول سکتا ہے، یہاں کے کوّے مستقبل کی خبریں دیتے ہیں، یہاں کی گوریاں بھی پوشیدہ باتوں کی خبر دیتی ہیں، یہاں کے طاؤس میں دلہن کی ایسی رعنائی ہے، یہاں کے بگلے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں، یہاں کی بکری ایک پتلی لکڑی پر چاروں پاؤں رکھ کر کھڑی ہو جاتی اور رقص کرتی ہے، یہاں کے بندر اپنی عقل میں ناقص بشر کی حد تک ہیں، یہاں کے ہاتھی بظاہر حیوان ہیں لیکن عمل میں انسان ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان کے جادوگروں کی تعریف

خسرو کی توجہ ہندوستان کے جادوگروں کی طرف بھی ہوئی، لکھتے ہیں کہ یہاں کے جادوگر مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں، سانپ کے کاٹے ہوئے مردوں کو چھ مہینے کے بعد بھی زندگی دے سکتے ہیں، یہاں عمر بھی بڑھائی جا سکتی ہے، یہاں کے جوگی حبس دم کی مشق کر کے دو سال تک زندہ رہ سکتے ہیں، یہاں کے اثر میں بارش بھی روکی جا سکتی ہے وغیرہ وغیرہ، یہ باتیں عمل میں آتی یا نہ آتی ہوں، مگر خسرو ہندوستان کی بڑائی بیان کرنے میں یہ سب کچھ جوش و خروش میں لکھ سکتے ہیں۔

ہندو عورت و مرد کے جذبۂ وفاداری کا احترام

خسرو اپنے ہم وطن ہندو عورت اور مرد کی اس خوبی سے متاثر تھے کہ وہ اپنے شوہر کی خاطر اپنے کو جلا کر راکھ کر سکتی ہیں، اور مرد اپنے بت اور آقا کی خاطر جان دینے میں دریغ نہیں کرتے، ان کی اس وفاداری کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے خسرو لکھتے ہیں کہ اسلام میں ایسی چیزیں تو جائز نہیں، لیکن شریعت اجازت دیتی تو وہ اس وفاداری کی سعادت کو حاصل کرنے کی تلقین کرتے۔[۴]

ہندوستانی حکمراں کے طبقہ کی ذمہ داریاں

ایک محب وطن کی حیثیت سے خسرو کی نظر جب اس ملک کے حکمراں طبقہ کی طرف بھی اٹھی ہیں، ان کی دلی خواہش یہی رہی کہ اس ملک کے بادشاہ، امراء، لشکری اور عام باشندے اپنے سیرت و کردار اخلاق و اطوار میں اچھے سے اچھے ہوں، اسی لئے وہ بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ وہ بیدار رہے، اس کی ہر رائے محکم ہو، جو کچھ کہے اس پر عزم و سکون کے ساتھ عمل کرے، کسی کام میں عجلت کو راہ نہ دے، انصاف پسند ہو، مظلوم کی آواز اس کے کانوں میں نہ پڑے، خواص و عوام کی آسودگی کا خیال یکساں طور پر رکھے، تاکہ جنگل اور محل کے رہنے والے دونوں خوش رہیں،[۵] امراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اگر ان کو خدا کو خوش رکھنے کا خیال غالب رہے گا تو وہ اپنے ملک کے بادشاہ کو بھی خوش رکھ سکتے ہیں، حقیقی مالک کی اطاعت گذاری ہی سے دنیاوی مالک کی فرمانبرداری آ سکتی ہے،[۶] وہ ہندوستانی لشکریوں میں بھی اچھے سے اچھے اوصاف دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے ان کو بھی نصیحت کی کہ وہ مذہبی نیز قوم کی خدمت انجام دیتے رہیں، غارت گری اور ناموری کے لئے نہ لڑیں، رعایا کی کھیتی کی حفاظت ہر حال میں کریں، خوب جگر سے کاشتکار جو چیز تیار کرتے ہیں، ان کو اپنے گھوڑوں کے پیٹ میں جانے نہ دیں۔[۷]

اچھے ہندوستانی کے اوصاف

پھر ایک اچھے ہندوستانی کے یہ اوصاف بتاتے ہیں کہ وہ سچے، خوش خو، نیک خو ہوں، جھگڑے میں دلوانے نہ بن جائیں، دوست انتخاب کریں، حماقت سے ان کو آتا ہے حسد اور بخل سے دور کر کوئی اور زبان نہیں۔[۸]

وطن کے علاقے کی تعریف

امیر خسرو ہندوستان کی محبت کا راگ اپنی زندگی کے آخر وقت تک الاپتے رہے،

---

۱ ایضاً ص ۱۷۹ ۲ ایضاً ص ۱۹۱-۱۸۱ ۳ ایضاً ص ۱۹۱-۱۸۱ ۴ ایضاً ص ۱۹۴-۱۹۱ ۵ مثنوی دہ سپہر بمبئی ایڈیشن ص ۹۵-۱۹۴ ۶ ایضاً ص ۲۹-۲۲۸ ۷ ایضاً ص ۲۲۹ ۸ ایضاً ص ۵۸-۲۵۶

اور یہ بیرونی ملکوں ہی سے ہندوستان پہنچا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مشہور ہے کہ پہلے ستار میں چار تار ہوا کرتے تھے، مگر خسرو نے اس میں تین تار اور بڑھا دیئے اور اس کا نام ستار رکھ کر خسرو کی طرف منسوب ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طبلہ بھی امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے لیکن ڈھولک کی ایجاد بھی عام طور سے انہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

وطنی محبت کے جذبے میں امیر خسرو ہندوستانی عورتوں کے گیت سے بھی متاثر ہوئے، اور خود ان کے جذبات کا اظہار اپنے ہندی گیتوں میں کرنے لگے۔ شادی بیاہ کے موقع پر جو گیت اور راگ گائے جاتے ہیں، ان میں سے سب کچھ امیر خسرو کی طرف منسوب ہیں۔ محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ دلی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں گھر گھر گاتی ہیں، درخت ہو تو اس میں جھولا ڈالتی ہیں، مل مل کر جھولتی ہیں، اور گیت گا گا کر بھی خوش کرتی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو۔

آجا ہوں نہ آدے سوامی ہو
اے ہو ہو پیا آون کہہ گئے
آون آون کہہ گئے
آئے نہ بارہ ماس
اے ہو ہو پیا آون کہہ گئے

یہ گیت امیر خسرو کا ہے اور سردا راگ میں لے بھی انہی کی رکھی ہوئی ہے، محمد حسین آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ موسیقی میں امیر خسرو کی طبیعت ایک ہی بھی کرتب دکھاتی تھی، اس لئے دھرپد کی جگہ قول قلبانہ، اگرچہ بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان کے اکثر گیت آج تک ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کی زبان پر ہیں، بہار راگ بسنت کے میلے ہی نے ان کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے، جسے گھر گھر کے ستار ہی انہوں نے نکالا ہے۔

خسرو کے بسنت کے گیت کی روایت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک بھانجے مولانا تقی الدین تھے، جن کو حضرت خواجہ بہت محبوب رکھتے تھے۔ ان کا انتقال عین شباب میں ہو گیا، حضرت خواجہ کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا، مہینے تک ان پر سکوت طاری رہی، اس سے امیر خسرو مغموم رہتے تھے۔ وہ برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو۔ اس زمانہ میں ہندوؤں کا بسنت کا میلہ لگا۔ وہ دہلی میں کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے اور مست ہو کر گیت گا رہے تھے۔ امیر خسرو بھی اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت موزوں کئے، سرسوں کے پھول توڑے اور پگڑی میں لگا کر مستانہ شان پیدا کی، جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے۔ امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر مسکرانے لگے۔ پھر تو امیر خسرو کا کام بن گیا۔ اس روز سے دہلی میں جب ہندو کالکاجی کے مندر پر جاتے ہیں تو دہلی اور قرب و جوار کے صوفیہ قوالوں کو لے کر کول کے پھول ہاتھوں میں لیے اشعار پڑھتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر جاتے ہیں وہاں سے حضرت خواجہ کے مزار پر آتے ہیں۔ ان اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

اشک ریز آمد ست ابر بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

قوال ہندی کی ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر اسی شعر کو بار بار دہراتے، ہندی کا ایک مصرع یہ ہے۔

عرب یار توری بسنت مانی

یہ چلتا تو بڑا اثر پیدا ہوتا، رفتہ رفتہ دہلی کی درگاہوں میں صدیوں تک بسنت میلہ رہنے لگا، دوسری جگہوں میں بھی مسلمان بسنت منانے لگے۔ بسنت کے موقع پر امیر خسرو کا ایک گیت ان کی طرف اس طرح بھی منسوب ہے۔

حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال
بائیس خواجہ مل بن بن آیو تاہیں — حضرت رسول صاحب جمال
حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال
عرب یار تیرو بسنت مانو — سدا رکھئے رکھئے لال گلال
حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال

ہندی زبان سے محبت

امیر خسرو نے اپنی وطنی محبت کی بنا پر یہاں کی زبان ہندی نہ صرف سیکھی بلکہ اس میں مہارت پیدا کی اور فخر کے ساتھ کہا کہ وہ ہندوستانی ترک ہیں، ہندی بول سکتے ہیں، وہ مصری نہیں کہ عربی میں گفتگو کریں۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

اور یہ بھی کہ وہ طوطی ہند ہیں، ان سے کوئی ہندی میں سوال کرے تو وہ میٹھی ہندی میں بول سکتے ہیں۔

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

وہ اپنی عبارتوں میں جا بجا کہیں کہیں ہندی الفاظ خوبصورتی سے استعمال کر کے بھی کرتے رہے، وہ خود کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں اشعار کہہ کر اپنے دوستوں میں تقسیم کرتے رہے مگر انہوں نے ان کا کوئی مجموعہ تیار نہیں کیا، یہ زیادہ تر عربی اشعار تھے جن کو انہوں نے محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اب بہت سے ہندی اشعار ان کے نام سے منسوب ہیں، جن کے متعلق یہ شبہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے واقعی ہیں بھی کہ نہیں، وہ ملمع یا اشعار بھی ہیں، البتہ ان کی تصنیف خالق باری کے متعلق یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ یہ انہی کی تصنیف ہے، گو یہ بھی شک و شبہ سے خالی نہیں، اس کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ فارسی جاننے والے بڑے اور بچے ہندی

---

۱. اسلامک کلچر حیدرآباد، جنوری ۱۹۵۵ء ۲. آب حیات ص ۶۹ ۳. پورا متن امیر خسرو کی ہندی شاعری مرتبہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میں درج ہے ص ۱۵۰۔ ۱۴۹ ۴. دیباچہ الکمال؛ نیز دیکھو دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۳۲ ۔ ۲۲۷۔

سے بھی واقف ہوں۔ یہ کتاب خسرو جیسے عبقری شاعر کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی مگر یہ کوشش اس لحاظ سے اہم ہے کہ رفتہ رفتہ ہندی اور فارسی کی آمیزش سے ایک ایسی زبان سامنے آئی جس کو اردو کہا جانے لگا، خسرو کی کچھ ایسی بھی غزلیں مشہور ہیں جن کا ایک مصرعہ ہندی اور دوسرا فارسی میں ہے، اسی لئے بعض ارباب نظر ان کو اردو شاعری کا موجد اور اس کے صنم خانہ کا برہمن قرار دیتے ہیں۔

خسرو نے اسی وطنی محبت میں یہاں کے بچوں کی تفریح طبع کے لئے بہت سی پہیلیاں اور مکریاں بھی لکھیں جو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں، یہاں کی لڑکیوں کی دلچسپی کے لئے بھی کچھ گیت لکھے، ان سب کو ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے اپنی کتاب امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری میں ان کی خالق باری کے ساتھ بوجھ پہیلیاں، بن بوجھ پہیلیاں، کہہ مکریاں، دو سخنے، ستیس، غزل، دوہے، آنکھ کا کسوہ، نسبتیں، سابل گیت، ڈھکوسلا وغیرہ کے عنوانات سے ایک جگہ جمع کر کے ایک مفید کام انجام دیا ہے۔ معلوم نہیں اس میں وہ مال کیوں نہیں شامل کئے گئے ہیں جو خسرو سے منسوب ہیں، یہ ساری چیزیں سامنے آگئی ہوتیں تو فیصلہ ہو سکتا کہ کیا چیزیں ان کی ہو سکتی ہیں اور کیا محض ان کے نام سے منسوب ہو گئی ہیں۔

تمت

خسرو نے اپنی فارسی شاعری میں اپنی وطنیت کا جو راگ الاپا ہے وہ ایک مستقل پیام ہے کہ ہم جس ملک میں پیدا ہوتے ہیں اور جہاں نشو و نما پاتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اس کی ہر چیز کو محبوب رکھیں، اس کا ہر شہر، اس کے باشندے، اس کی آب و ہوا، اس کی زبانیں، اس کے علوم و فنون، اس کی عورتوں کا حسن، اس کے پھول، پھل، جانور اور یہی کہ اس کے جادوگر اور رہٹ بھی محض اس لئے عزیز ہوں کہ وہ وطن کے ہیں، وہ اپنی مذہبیت میں اپنی مثال آپ رہے، اور کہ جیسے کے سوز عشق الٰہی برحق ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الاولیاء کو محور رہا، اس کے ساتھ اپنی وطنی محبت کو اپنے ایمان کا جزو بنائے رکھا، انھوں نے مذہب کے جام شریعت اور وطنیت کے سندان عشق کی حسین آمیزش سے باہمی محبت، یگانگت، مفاہمت اور اتحاد و یکجہتی کی جو ست گنگا بہائی اس سے ان کی ذات اس روشنی کا ایک بلند مینار رہے کہ مذہب کی راسخ العقیدگی دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی، مذہب کی پاسداری اور عمل میں بے اخلاص ہو تو یہی سچائی دلوں میں فراخ دلی پیدا کر سکتی ہے جس سے دلوں کی تسخیر آسانی سے ہو سکتی ہے۔

بقیہ - امیر خسرو بحیثیت ایک عوامی شاعر

خسرو کے عہد میں دیسی اور فارسی لفظوں کے میل سے ایک نئی زبان بن رہی تھی ایسے وقت پر خسرو کی دور رس نظروں نے فرہنگ کی ضرورت کو بھی محسوس کیا۔ انھوں نے اپنی ہندی اور فارسی پہیلیوں، دو سخنوں اور فرہنگ نامے خالق باری میں ہندوی دیسی الفاظ کے مقابل فارسی کے علمی الفاظ رکھ کر دیسی الفاظ کے صحیح معنی متعین کرنے کی کوشش پہلی بار کی ہے۔

خالق باری خسرو کی معمولی ترین تصنیف ہے جو سارے ہندوستان میں مختلف بولیوں کے حلقوں میں سات سو سال تک مکتبوں پر چھائی رہی۔ اس کتاب نے سارے ملک کو ایک ہندوستانی گر زبان تو سکھائی لیکن مکتبوں کے ماحول میں خود بھی تحریف اور تخریب کی زد میں آگئی۔ اس میں بعض جگہ خسرو کی بات سے مطابقت، ناموزوں اشعار اور غلط الفاظ آگئے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس تصنیف کا رشتہ ہی خسرو سے توڑ دیا جائے۔ خسرو کے جشن ہفت صد سالہ کے موقعہ پر خالق باری کے یہ سارے نقائص دور کرنے کی ایک اجتماعی اور متفقہ کوشش ہونا چاہئے۔ خالق باری ایک مختصر کتاب ہی لیکن تاریخ زبان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

بقیہ - حیات خسرو

صنعت بھی خاص ان کی ایجاد ہے۔ اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے اس کے بعد کا لفظ دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہوتا ہے مثلاً

مورا ای رخ تو کشت مارا

یہ فارسی مصرعہ ہے لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو "مارا" ہوگا۔ اس لئے مصرع کا آخری لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں پورے شعر کی مثال لکھی ہے۔

محتمل المعانی

یک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے بہت سے معنی ہیں اور ہر معنی یہاں مراد لئے جا سکتے ہیں۔

موقوف الآخر

ایک رباعی لکھی ہے جس کا ہر قافیہ دوسرے مصرعہ کے آغاز کا محتاج ہے مثلاً

در حسن ترا کسے نماند الا — خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند و پائے تو بوسد اما — می ترسد ازو ہر کہ بہ بوسد تا

ایسی صنعتوں اور نکات کا دفتروں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں۔ اگر کسی صاحب کو تفصیل سے زیادہ مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں۔

ڈنیا کے بڑے آدمیوں کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ
ماں وہ ایسے حالات و ماحول کا ماحصل تھے اور کس حد تک انھوں نے حالاتِ خود
رد وپیش کے حالات پر اثر انداز ہوئے اور ان کو تبدیل کرنے کے کام میں حصہ لیا
ہاں تاریخ ایک طرف بڑے آدمی بناتی ہے وہاں دوسری طرف بڑے آدمی تاریخ
نے ہیں۔ دونوں لحاظ سے حضرت امیر خسرو ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی یک جہتی
ہ تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف اس دور کی وہ صحیح نمایندگی کرتے
ں اور دوسری طرف ہندوستان کی تاریخ پر ان کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

حضرت امیر خسرو غالباً وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے خلوصِ نیت
ے وطن کی محبت، رواداری، وسیع المشربی، فراخدلی، کشادہ ذہنی اور ان کے
ریعہ تہذیبی یک جہتی کی تبلیغ اپنی منظوم اور منثور تصانیف میں کی اور اسے طرز
ل میں اُن صفات کو عملی جامہ پہنایا۔ ان کی نظر میں ہندوستان ریں پر جلدِ
ں تھا۔ اِس ملک کے لوگ، اُن کے علوم، فنونِ لطیفہ، یہاں کی آب و ہوا،
سم، پھل پھول، چرند و پرند، عمارتیں، ملے ندی اور دریا، سماجی اور مذہبی رسوم
ں کہ ہر چیز دوسرے ملکوں پر فوقیت اور برتری کی حامل تھی۔ ہندوستان کی سرزمیں
ے امیر خسرو کو اس لیے جذباتی لگاؤ تھا کیوں کہ اُن کا جنم اسی سرزمیں پر ہوا تھا۔
ں کی والدہ ہندی نژاد تھیں۔ وہ بھی اسی ملک میں پیدا ہوئیں۔ اور اسی آب
ہوا، تہذیب و تمدن میں پل کر وہ بڑی ہوئیں۔ اس وجہ سے ان کے رگ و
ے میں ہندوستانی معنوی اور ظاہری دونوں لحاظ سے سرایت کر چکی تھی۔ امیر
ر وپران کا بہت گہرا اثر تھا۔ امیر خسرو نے بیرونی ممالک سے اپنے آبائی تعلقات

کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ ہندوستانی تہذیب کی معنوی روح کو صحیح اور
گہرے انداز میں جذب کئے بنا اور اُن اقدار کو اچھی طرح سمجھے بغیر جن کی وہ حمایت
کر رہے تھے، یہ رجحان ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

"خزائن الفتوح" کی بعض عبارتوں کے مطالعہ سے بادی النظر میں ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ امیر خسرو متعصب اور راسخ مذہبی آدمی تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس
ہے۔ اس سلسلے میں سومنات کے بارے میں اُن کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے [1]

امیر خسرو کے آبا و اجداد کا اصلی وطن کش تھا جو بعد میں قبۃ الخضراء شہر سبز کے
نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان کا تعلق ہزارہ قبیلہ سے تھا۔ اور یہ قبیلہ ہزارہ لاچین
کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ یہ قبیلہ نسلاً ترک تھا۔ چوں کہ خسرو کے والد امیر
سیف الدین محمود بھی اس قبیلہ کے ایک فرد تھے۔ اس لیے خسرو نسلاً ترک ہوئے۔

ہندوستان آنے کے بعد امیر سیف الدین محمود کی شادی عماد الملک [2] کی بیٹی
سے ہوئی اور ۱۲۵۲ء یا ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ہی میں خسرو تولد ہوئے۔

خسرو نے اپنے ہندی نژاد ہونے کا خود ذکر کیا ہے اور حب الوطنی کی دلیل
اس طرح پیش کی ہے۔

ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن

دوسری ایک جگہ خسرو نے جہاں اپنی عربی دانی کا ذکر کیا ہے وہاں اس بات
کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ ان کے عربی کلام میں وہ شیرینی اور حلاوت نہیں ہے
جو ایک عرب شاعر کے ہاں پائی جاتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ
وہ ہندی نژاد ترک تھے۔

"خزائن الفتوح" روضہ ہندوستان کہ فردوسِ ولایت او بہار است" ص ۴۴ [2] "خزائن الفتوح" (فارسی) ۵۲

سلطان التمش کے نامور امیروں میں عماد الملک کا شمار ہوتا تھا۔ دور تمشی اور بلبنی میں بیس سال تک وہ "عارضِ ممالک" کے عہدے پر رہے اور دور تمشی میں حکومت کو استحکام
پانے میں انھوں نے بڑا اہم حصہ لیا۔ بقولِ خسرو، ان کے نانا کا شمار سلطنت کے چار ارکان میں ہوتا تھا اگرچہ وہ کوئی شان بادشاہی نہ رکھتے تھے لیکن بادشاہوں کو تخت پر بٹھایا
تے تھے اور اپنی جود اور سخا سے تمام ہندوستان کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ پان کھانے کے بڑے شائق تھے اور ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔

ہندوؤں نے بید عارا سے ترک کر دیا ہے لیکن مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی اس علم سے نابلد ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے مذہب کی پیروی نہیں کرتے ہیں تاہم ان کے سبب سے معاندہم سے ملتے ہیں۔ وہ اللہ تعالے کی وحدت کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالے میں ہر چیز کے پیدا کرنے کی قدرت ہے وہ تمام چیزوں اور ساری مخلوق، آدمی، جانور، اور سارے لوگوں کا قادر مطلق ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ لہذا متشکلیں، عسائیوں، زرتشتیوں اور منکروں سے برہمن کہیں زیادہ تر ہیں۔ حالاں کہ وہ پتھروں، سورج، جانوروں، درختوں کی پرستش کرتے ہیں لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ ان سب چیزوں کا خالق خدا ہے وہ ان اشیاء کو خدا کی تمثیل سمجھتے ہیں ان غیر جانداروں کا رہ خود کو مطیع نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ پرستش کا یہ طریقہ قدیم الایام سے ان کے ہاں مروج ہے وہ اس کو ترک کرنے سے مجبور ہیں[1]

ہندوستان سے محبّت کی وجہ

مثنوی نہ سپہر میں وہ ہندوستان کا راگ الاپتے ہیں وارفتہ اور بے خود ہو جاتے ہیں اور اسی عالم میں کہتے ہیں۔

حکمت و دانائی و علم و ہنر   دا نچہ کہ در ہند معاینست دگر

اس کے بعد کہتے ہیں کہ مجھے ہندوستان سے اس لئے والہانہ محبت ہے کہ یہ میرا مولد اور وطن ہے اور اپنے اس جذبہ کی تائید میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ حبّ الوطن من الایمانٌ

حب وطن ہست ز ایمان یقین[2]

پھر وہ ہندوستان کو ایک جنت ارضی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے سات وجوہ بیان کرتے ہیں۔

کشور ہند است بہشتے بزمیں   ہفتش ایک رخ صفحۂ مہ یقیں
ہست ثابت چو وراں ست ہفتے   ہفت گویم بہ درستی یکے[3]

ہندوستان کی آب وہوا

محمد سلیمان اشرف لکھتے ہیں۔

" شاعری پر ملک کی آب وہوا کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو چیزیں کہ نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں اور خصوصاتِ ملکی جس طرح کے جذبات و کیفیات قلوب میں پیدا کرتی ہیں، اسی کو شاعری کا مایۂ خمیر سمجھا چاہتے اسی لئے ہر ملک کا باشندہ اپنے پسند کا معیار مدار کار رکھتا ہے۔ ایک ہندی عاشق زلفِ معشوق کی تشبیہ و توصیف میں مجبور ہے اڑاتا ہے۔ برسات کی رات اور کالی گھٹا کو اس کا عکس بتاتا ہے"[4]

ہندوستان کی آب وہوا کا گہرا اثر خسرو کے کلام میں پایا جاتا ہے اور یہاں کی آب وہوا کو خسرو خراسان اور دوسرے ملکوں کی آب وہوا سے بہتر بتاتے ہیں اور اس بات کے لئے دس دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) یہاں کی سردی نقصان دہ نہیں (۲) ہندوستان کی گرمی خراسان کی سردی سے بہتر ہے (۳) سرد ہوا کے خوف سے یہاں کے غربا کو سردی کے زیادہ سامان کی ضرورت نہیں ہوتی (۴) سال بھر تک یہاں گل و گل کی بہار رہتی ہے (۵) یہاں کے پھول گل بادہ کی طرح خوش رنگ ہوتے ہیں (۶) ہندوستان کے پھول سوکھ جانے پر بھی خوشبو دیتے ہیں (۷) یہاں آم، کیلا، الائچی، کافور اور لونگ جیسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں (۸) خراسان کے بہت سے میوے اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہاں کے میوے خراسان میں نہیں ہوتے (۹) یہاں کے پان اور کیلا جیسا (۱) پان عسا دنیا میں دوسرا کوئی میوہ نہیں[5]

ہندوستانی موسم

امیر خسرو نے اپنی مثنویوں اور قصائد میں ہندوستان کے موسموں، مثلاً موسم بہار فصلِ خزاں، برسات کی رات اور صبح وشام کی کیفیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے فصلوں اور موسموں کا تغیر، صبح وشام اور رات اور دن کا ہونا ہر جگہ ایک نئے پیرائے میں بیان کیا ہے مثلاً خزاں کے موسم کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جب فصل خزاں نے چمن میں گھر بنا لیا تو بادِ خزاں نے گلزار میں اپنا گھوڑا کدا لے گئی گلِ ریحان جو پھولوں کا بادشاہ کہلاتا ہے اس کو نکال دیا۔ اس چمن کے اندر اس کی حکومت نہ رہی۔

فصلِ خزاں چوں بہ چمن خانہ ساخت   بادِ خزاں کرد بہ گلزار تاخت
شاہِ سپر غم بہ ولایت برآمد   گشت بہ چمن ہیچ ولایت نماند

ہندوستانی جانور اور پرند

امیر خسرو نے جانور اور پرند کو اپنی محبت سے محروم نہ کیا تھا کہتے ہیں کہ اس ملک کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں، مینا عرب و عجم میں نہیں پائے جاتے اور یہ پرند بھی آدمی کی طرح بول سکتا ہے کوا مستقبل کی خبر دیتا ہے گور تا اپنی آواز پرواز وغیرہ میں عجیب و غریب ہے۔ دوسرے بہت سے عجیب و غریب پرندے اس ملک میں بھرے پڑے ہیں طاؤس اپنی خوبصورتی میں دلہن کی طرح رعنائی رکھتا ہے۔ یہاں بکرے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب و غریب کرتب دکھانے لگتے ہیں۔ یہاں پانی بھرے ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ پرندوں کے بعد پانچ جانوروں کے اوصاف بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایک ایسا جانور ہوتا ہے جو ہرن کے مانند اور گیدڑ کی

---

[1] مثنوی نہ سپہر، ۱۶۱۔ ۱۶۵ [2] ایضاً، ۱۴۹۔ ۱۵۰ [3] مثنوی دول رانی خضر خان میں کہتے ہیں۔
بہشتے فرض کن ہندوستاں را   کہ اینجاست است ایں بوستاں را   دگر نہ آدم و طاؤس را آسمانے   کجا لا بحا شد مدی منزل آرائے۔
یہ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثنوی "نہ سپہر" ۱۴۹۔ ۱۵ [4] مقدمہ "ہشت بہشت" ۲۳ ۲۴ [5] مثنوی نہ سپہر ۱۵۸۔ ۱۶۱ [6] قران السعدین ۱۵۰ برائے فصلِ بہار ملاحظہ ہو۔ ایضاً ۲۶۰،
دول رانی خضر خان۔ خسرو کہتے ہیں کہ بعض لوگ آم کو انجیر پر ترجیح دیتے ہیں   دگر کس سوئے تو دگر دہت گیر   ہدکم تعرکِ ما دا از انجیر ۴۳

طرح بولتا ہے گھوڑا، بکری، بندر اور ہاتھی۔[۱]

ہندوستانی معمار

امیر خسرو نے جب ہندوستان کی قدیم عمارتوں کو دیکھا تو وہ اس ملک کے معماروں اور سنگ تراشوں کی صناعیوں سے بہت متاثر ہوئے اور بڑی فراخدلی سے اُن کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

یہاں کے سنگ تراش جوانے فن میں فرہاد کو مات کرتے تھے۔ پتھروں کو اس قدر صاف اور چکنا بنا دیتے تھے کہ ان کی سطح پر سے خیال کا پاؤں بھی پھسل جائے۔ دہلی کے معمار جو فن عمارت میں لقمان ہندوستان کی حامل سمجھتے تھے، ایک پتھر کو دوسرے سے اس صفائی سے جوڑ دیتے تھے کہ باریک سے باریک بھی ان کی درزوں میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔[۲]

ہندوستان کی زبانیں

اس زمانے میں اس ملک میں بولی جانے والی اور مقامی زبانوں میں امیر خسرو نے ترکی اور فارسی کے ساتھ سندھی، ہندوی، لاہوری، گجراتی، کشمیری، کبرتی، دھور سمندری، تلنگی، گوڑی، معبری، گوری، بنگالی، اودھی اور سنسکرت کا ذکر کرتے ہیں۔ سنسکرت کو عربی سے کمتر اور فارسی سے برتر بتایا ہے جبکہ ہندوی زبان میں فارسی سے کسی طرح حلاوت اور شیرینی کم نہیں۔[۳]

ہندوستان کے بعض شہروں کا بیان

جن شہروں میں امیر خسرو کو قیام کرنے کا جنھیں کا موقع ملا اُن کی توصیف بیان کرنے میں انھوں نے خوب زور قلم دکھایا ہے اور ان شہروں کے ذرہ ذرہ میں انھیں ایسی خوبی اور دلکشی نظر آتی ہے کہ جسے دنیا کے کسی دوسرے شہر میں نہیں پائی جاتی۔

دلّی

دلّی اور دلّی کی عمارتوں، باغوں، پھول پھلوں اور وہاں کے باشندوں کا ذکر امیر خسرو کے لئے دل آویز موضوع ہے۔ اس کارنامے میں خسرو کا فخر بجا ہے۔ دلّی کی محبت خسرو کے رگ و پے میں اس لئے سرایت کر گئی تھی کہ اس شہر میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا تھا۔ دہلی اسلامی اور ہندو تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی اور اس شہر میں علمی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی سرگرمیاں پائی جاتی تھیں۔ مزید برآں دلّی میں اس لئے بھی جاذبیت اور کشش پائی جاتی تھی کہ وہاں شیخ نظام الدین اولیاء سکونت پذیر تھے اور ان کے فیضان رحمت کے چشمے ملک کے دور دراز علاقوں کو سیراب کر رہے تھے۔ بہت سے لوگ دور دور سے کسان، کتان، پردار، وارد دہلی کی طرف چلے آ رہے تھے۔ دلّی سلاطین دہلی کا دارالخلافہ تھا، اس لئے پرشکوہ، پرعظمت اور خوبصورت عمارتوں سے آراستہ پیراستہ تھی۔ شعر و شاعری کا چرچا اس قدر تھا کہ بقول امیر خسرو جس پتھر کو بھی اٹھاؤ اس کے نیچے سے ایک شاعر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ یہی وہ دلّی جو خسرو کی نظر میں بغداد، مصر، خراسان، خطا، تبریز، ترمذ، بخارا اور خوارزم وغیرہ پر سبقت رکھتی تھی۔

دہلی سے دور ملتان میں قیام کے دوران انھوں نے ملتان کے مقابلے میں اس شہر کو بہشت قرار دیا ہے۔ دہلی کو یاد کر کے بیکل ہو جاتے ہیں، اور کہتے ہیں۔

"ایک وہ زمانہ تھا کہ میرا مسکن قبۃ الاسلام تھا جو ہفت اقلیم کے بادشاہوں کا قبلہ ہے یعنی وہ دہلی جو ہمشیرۂ آسمان ہے اور روئے زمین پر جنت بریں کا ایک ٹکڑا ہے۔ نو آسمان جس پر اتنا مبارک سایہ ڈالے ہوتے ہیں اور ربعیت اقلیم اس کے دروازے کا حلقہ ہیں۔ اس کے بلند قصر آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور سورج پر بھی سایہ ڈالتے ہیں اور اس کے بازاروں میں آدمیوں کا اتنا اژدہام رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی۔ اس کے سرسبز میدانوں میں پھول کھل رہے ہیں اور اس کے چشمے چمکدار آنکھوں سے بھی زیادہ صاف اور روشن ہیں جن کا بہتا ہوا پانی آب حیات کی طرح خوش گوار اور نباتات میں سے بہتے ہوئے دودھ کی طرح شیریں ہے۔ حوض سلطانی ایسا روشن معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کو پگھلا کر شہر میں ڈال دیا ہے۔ اس کے باغات میں تماشائیوں کا ہجوم، جن میں سے ہر ایک لالہ رخسار تھا۔

گوش کی وہ چمک دمک کہ کان کے موتیوں کی آب کو بھی ماند کر دے۔ جو دو زبان کے نغمے اس کے باغوں میں بلند ہوتے ہیں ایسے شیریں کہ درخت مخمور ہو جائیں۔ اور چشمے آدھ کھلے نرگس۔ وہاں میرے دن سیر اور تماشے میں اور راتیں ایک محبوب کی صحبت میں بسر ہوتی تھیں۔[۴]

ایک دوسرے موقع پر دہلی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ عدن کی جنت ہے، اپنی خصوصیات اور صفات میں باغ ارم کے مانند ہے۔ اس بوستان کے نقش کو اگر کبھی ہندوستان کا طواف کرنے لگے اور اس شہر کی سیر کرے تو مکہ بہرہ ہو جائے۔ پہاڑی پر آباد ہے۔ اس کے اردگرد دو میل تک باغات لگے ہوئے ہیں۔ جیسے اس کی آبادی ہوتی ہے یہ شہر کے پرانے قلعوں اور قلعہ کے ساتھ ساتھ حوالی شہر میں واقع تلپٹ، اندرپت، ہارپور اور افغان پور کا بھی ذکر ملتا ہے۔ دہلی کے باشندے فرشتہ سیرت اور حسین

۱۔ مثنوی "نہ سپہر" ۱۸۱۔۱۹۱؛ "خزائن الفتوح" ۸، ۹، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۹۔ ۲۔ خزائن الفتوح، ۲۳
۳۔ مثنوی "نہ سپہر" ۱۷۰۔۱۸۱ امیر مثنوی "دولرانی خضر خان" ۴۱، ۴۲ ۴۔ "خزائن الفتوح" میں "قبۃ الاسلام" لکھا ہے۔
۵۔ حوض شمسی یا قطب صاحب کا تالاب سلطان التمش نے ۱۲۲۹ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ملاحظہ ہو آثار الصنادید (دہلی ۱۹۶۵ء)؛ قران السعدین ۲۲۔۲۳
۶۔ دیوان "غرۃ الکمال"؛ قران السعدین ۲۸، ۲۹

ہندوستانیوں کی وفاداری

ہندوستان کی دوسری خصوصیات کے علاوہ امیر خسرو نے اس ملک میں ایک ایسی خوبی پائی تھی جو دنیا کی کسی اور قوم میں آج بھی نہیں ملتی کہ تیرہویں صدی عیسوی میں بھی ہندو عورت اور مرد کی وفاداری دیکھتے ہیں۔

"ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے کھیل جاتا ہے اور ہندو عورت اپنے شوہر کی محبت اور وفاداری میں اس کی چتا میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ ایک ہندو مرد اپنے بت اور آقا کے لئے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ اسلام میں ان باتوں کی اجازت نہیں تاہم یہ باتیں قابل ستائش ہیں۔ اگر اسلام اس کی اجازت دیتا تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں دے دیتے۔"[۳]

اگرچہ رسمی سبق آموز ہے تو بقول خسرو آتش پرستی اس سے کسی لحاظ سے بھی کم اہمیت نہیں رکھتی ہے اور اس عمل سے نفس کشی ملتی ہے۔ ایک آتش پرست ہندو کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ہندو سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی کیوں پوجا کرتا ہے اس کے لئے جان کیوں دیتا ہے، تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ آگ کو دیکھ کر وصل کی امید روشن رہتی ہے اور آگ میں جل کر بقا حاصل ہوتی ہے۔[۴] اس جذبے کی قدر کرنے کا خسرو نے اس لئے مشورہ دیا ہے کہ صوفیا بھی صادق محبت الٰہی کی آگ میں جل کر واصل باللہ ہوتے ہیں۔

لڑکی کی ولادت

ہندوستان کے محاسن کی امیر خسرو نے ستائش کی ہے لیکن بعض باتوں کی مذمت بھی کی ہے جو کسی بھی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً قدیم الایام سے ہندوستان میں لڑکی کی ولادت کو ناگوار سمجھا جاتا رہا ہے اور دیہی علاقوں میں آج بھی یہی صورت حال ہے۔ امیر خسرو نے ایسے باطل خیالات کی تردید کی ہے اور لکھتے ہیں کہ عورت کا وجود ہی نوع آدم کی افزائش کے لئے مرد سے زیادہ اہم و لازمی ہے جس سے تولد کرنے والا انسان پیدا ہوتا ہے تو پھر انسان کو جس کی بدولت کرامت انسانی حاصل ہوتی ہے اس کے وجود کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا ہرگز روا نہیں۔[۵]

شادی بیاہ کے رسوم

جب ترک مسلمانوں نے اس ملک میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تو رفتہ رفتہ ہندوؤں سے ان کا میل جول بڑھنے لگا۔ ہندوستانی عورتوں سے شادی بیاہ ہونے لگے۔ نتیجتاً ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کے عمدہ عناصر اپنا لئے اور تہذیبی یکجہتی کا کام شروع ہو گیا جو دن بدن تکمیل پر ترقی پا رہا۔ مسلمانوں نے شادی بیاہ کے رسوم بالخصوص اپنائے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کی شادی کے موقع پر جو رسوم ادا ہوتے تھے، وہ نکاح کے سوا سارے کے سارے خالصتاً ہندوستانی تھے۔[۶]

امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی

امیر خسرو ہندوستانی موسیقی میں دسترس رکھتے تھے اور بعض راگ راگنیوں کے موجد بھی تھے۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ امیر خسرو علم موسیقی سے واقف تھے۔[۷] خسرو نے خود بھی اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ان کا طریقہ یہ نہ تھا کہ وہ جھوٹے دعوے کریں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک قطعہ ہے۔

مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنج سخن
علم موسیقی ز علم شعر نیکوتر بود[۸]

بلاشبہ خسرو کو ایرانی اور ہندوستانی فن موسیقی میں مہارت حاصل تھی۔ ان کی تصانیف میں فارسی اور ہندوستانی راگ اور راگنیوں کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔ انہوں نے متعدد جگہ ہندوستانی راگ راگنیوں، الاپ، دھرپد وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ستار ایجاد کیا، مردنگ کو ڈھولک میں تبدیل کیا، ایرانی یا طنبور کی بجائے ستار ایجاد کیا۔ ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں۔

"یہ بات محض مبالغہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی راگ میں بہت کچھ تصرفات کئے تھے، اور ان میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ وہ ایک نئے مسلک اور طریقے کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں ان کے اس طریقے کے پیرو نہ صرف ان کے اپنے زمانے میں تھے بلکہ اب تک بھی موجود ہیں۔"[۹]

خسرو کی ہندی شاعری

ان کے فارسی کلام میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ ملتے ہیں اور بالخصوص ہندی کلام تو خالصتاً ہندی زبان میں ہے۔ یہ مسئلہ ابھی تک معرض بحث میں ہے کہ آیا جو ہندی کلام خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے وہ ان کا کلام ہے بھی یا نہیں؟ اس پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ خسرو نے ہندی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہوگی کیونکہ امیر خسرو اس زمانے کے سب سے عظیم الشان شاہی اشخاص کے درباری شاعر تھے لیکن انہوں نے عوام سے اپنا ناتا کبھی نہیں توڑا اور ان کو عوام کا شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک عوامی شاعر وہی شخص ہو سکتا ہے جو عوام کے جذبات اور افکار کی ترجمانی کرے۔ امیر خسرو شیخ نظام الدین اولیاء کی صلح کل کی تحریک میں شریک کار تھے۔ خسرو ہندوستان کی بیشتر اہم زبانوں سے واقف تھے اور ہندی ان کی مادری زبان تھی اس لئے عوام کے دلوں تک پہونچنے کے لئے امیر خسرو نے اپنی مادری زبان میں ضرور طبع آزمائی کی ہوگی اور صلح کل کا پیغام عوام کی زبان کے ذریعہ ہی ان تک پہونچایا ہوگا۔

امیر خسرو نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے ایک پیغام چھوڑا ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کی بقا کا انحصار وسیع المشربی، رواداری، وسیع النظری اور وطن دوستی پر ہے۔ مذاہب دلوں میں دوری پیدا نہیں کرتے بلکہ دلوں کو جوڑتے ہیں۔ مذہب عشق اور اللہ کی تلاش سے زیادہ افضل کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے۔ باقی ص

---

۱ مثنوی مہ سپہر، ص ۱۹۴ ۔ ۱۹۵ ۲ مثنوی دولرانی خضر خاں، ص ۱۹۵-۱۹۶ ۳ مثنوی ہشت بہشت ... ۲۶ ۳۳ ۴ تفصیل دیکھئے ... دولرانی خضر خاں ص ۱۴۸-۱۵۰

۵ تذکرۃ الشعراء ۶ ... دیوان خسرو ... ۵۶ ... ہشت بہشت (مقدمہ) ۲۳ ۷ امیر خسرو ۳۳۶ ... حیات امیر خسرو ص ۲۹ - ۲۸ باقی ص

حسن الدین احمد

امیر خسرو اور مسئلہ انسانیت پر چشتیہ سلسلہ کے اثرات

اس نقطۂ نظر سے خسرو کی شاعری کا خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اپنے کلام میں انسان کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ اور انسان کا کیا مقام متعین کیا ہے۔ یہ خسرو شناسی کا تقاضا ہے کہ ان کی انسان دوستی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے اور پھر ان کے حالات اور سرچشمہ کو تلاش کیا جائے۔

اس موقع پر ہیومنزم یا مسلک انسانیت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہیومنزم وہ فلسفیانہ تصور ہے جس کے موجب انسان عالم فطرت کی قوتوں کے سامنے عاجز اور مجبور نہیں ہے بلکہ وہ مستقل وجود، فعل و ارادہ اور عمل و اقتدار رکھتا ہے اور کچھ حد کے اندر اپنی زندگی اور اپنی تقدیر جس طرح چاہے متعین کر سکتا ہے۔

خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے۔ وہ رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہیں جو سوز و درد و داغ و جستجو و آرزو سے عبارت ہے اس لئے ان کی شاعری میں انسانی جذبات سے ملتے ہیں۔

من نمی دانم که چون باشد پری
شکل تو باری مرا دیوانه کرد

(میں نے پری تو نہیں دیکھی کہ کیسی ہوتی ہے لیکن تیری صورت نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔)

اس قسم کے ہزاروں اشعار ملتے ہیں جن میں احساسات زندگی کی بھرپور نمائندگی ہے۔

امیر خسرو نے ایسی طبیعت پائی ہے کہ ان کو اگر ایک طرف روحانی لگاؤ اور اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء سے کمال عقیدت ہے جیسا کہ حسب ذیل اشعار سے:

هستی تو آن نظام که از نون خطاب تو
محراب راست کرده برای عبادت است
تو شمع صبح و سعادت تویی که از تو خواست
زان هر یکی برآرد چراغ هدایت است

تو دوسری طرف وہ سماج سے بھی رشتہ جوڑے ہوتے ہیں۔ انسانوں کے باہمی تعلق اور رہن سہن سے متعلق وہ یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ:

خسرو مگوی بد که درین گنبد از صدا
هر آنچه گفته اند همانا رسیده باد

(خسرو کسی کو بھی برا مت کہو کیونکہ دنیا میں لوگ جو کہتے ہیں وہی انہیں خود بھی سننا پڑتا ہے)۔

طبیعت کی اس رنگارنگی نے ان کی شخصیت کو انفرادیت عطا کی ہے۔

امیر خسرو کی اصل نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی انسانی حقیقت کے معتبر ترجمان قرار پائے۔ انسانی عظمت کا تصور امیر خسرو اور پھر بیدل کے ذریعہ اردو شاعری کو ملا۔ اردو کے اساتذہ میں میر۔ سودا۔ درد۔ نظیر۔ آتش۔ غالب۔ انیس سب انسانی عظمت کے علمبردار ہیں۔ اگر آج اردو شاعری عظمت انسانی کی علمبردار ہے تو یہ حضرت امیر خسرو کا طفیل ہے۔

سوائے شیخ سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گذرا جس نے خسرو کی طرح عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہو۔ اور جس کا نام زبان زد خاص و عام ہو۔ یہ صحیح ہے کہ سعدی فارسی غزل گوئی میں سب کچھ شہرت حاصل کر چکے تھے لیکن ان کی غزل میں وہ سوز و گداز اور جوش و خروش نہ تھا جو انسان کے جذبات کو ابھارے۔ خسرو کی طبیعت میں ایسی نیرنگی تھی جو انسان کو زندگی کے اسرار تک پہنچنے پر ابھارتی ہے۔ اور اس میں جامعیت کی خواہش پیدا کر لی ہے۔

امیر خسرو کا شمار اپنے زمانہ ہی کے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے ان کے جامع کمالات ہونے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے زندگی سے بھرپور دلچسپی لی۔ اور زندگی سے گوناگوں تجربے کئے۔ ان کو بنیادی طور پر حیات انسانی سے پیار اور لگاؤ تھا۔ اور یہی چیز ان کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

هر دم که بخوشدلی برآید
سرمایهٔ حاصل جوانی است

(جو وقت خوش دلی کے ساتھ گزر جائے وہی جوانی کا حاصل اور سرمایہ ہے)

وقت نے حضرت امیر خسرو کے مقابلہ میں اپنی ہار مان لی ہے۔ وقت بڑا ظالم ہوتا ہے

وقت کی چکی بڑے بڑوں کی شہرت اور بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ انسان کے اعمال بدل جاتے ہیں، زبان بدل جاتی ہے، ملک اور بڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت امیر خسرو کا شمار بلاشبہ ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق کہا گیا ہے۔

رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

امتداد زمانہ سے ان کے پیام کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ جیسے جیسے انسان بیدار ہوگا ان کے پیام کی اہمیت بڑھے گی۔ امیر خسرو کا پیام صلح و آشتی، محبت و اخوت کا پیام ہے آج انسانیت اس کی سخت ضرورت ہے۔ شاید آج سے قبل اس پیام کی اتنی ضرورت کبھی نہ تھی۔ آج دنیا کو ان کے محبت بھرے اور دلوں کو جوڑنے والے آدرشوں کی ضرورت ہے۔

حضرت امیر خسرو حکومتی حلقوں میں رہتے ہوئے بھی عوام کے آدمی تھے۔ انھوں نے بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ رہتے ہوئے زندگی ایسے گزاری کہ۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ایسا صرف وہی آدمی رکھ سکتا ہے جس کا ظرف بڑا ہو

حضرت امیر خسرو نے مسلک انسانیت پر زور دیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلک انسانیت جدید مغربی فلسفہ کی دین ہے۔ لیکن یہ بات سائنٹفک طور درست نہیں ہے لیکن جس ابتدائی تخیل کے ارتقاء سے مسلک انسانیت کا موجودہ مفہوم وجود میں آیا وہ یقیناً بہت قدیم ہے بالعموم تاریخ دور میں اسلام نے اس تخیل کو کافی بڑھاوا دیا قرآن شریف کو بجا طور پر عظمت انسانی کو تسلیم کرنے والی پہلی دستاویز اور منشور انسانیت قرار دیا جا سکتا ہے۔

قرآن شریف میں انسانوں کو خدا کا بندہ کہہ کر اس کی حیثیت کا نہ صرف تعین کر دیا گیا بلکہ اس کو تسلیم بھی کیا گیا۔ جب یہ کہا گیا کہ سب انسان خدا سے برابر فاصلہ پر ہیں اور سب انسانوں سے خدا کا رشتہ یکساں نوعیت کا ہے تو اس سے نہ صرف انسانی مساوات پیدا ہوئی بلکہ انسان کی بڑائی کا پہلو نہایت واضح انداز میں سامنے آیا۔

قرآن شریف میں بار بار نوع انسان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ "ہم نے بنی نوع انسان کو عزت بخشی اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر فضیلت دی" زمین اور آسمان اور سب چیزیں جو زمین میں ہیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ ۲۱۱۲۲ اور ۲۹۱۲ خدا نے رات اور دن سورج اور چاند کو انسان کے لئے مسخر کیا ۱۲۱۱۶ دریا کو اختیار میں دیا ۱۴۱۱۶ چوپایوں کو انسان کے لئے بنایا وغیرہ خدا نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں ۲۲۱۲ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۹۵ ۴ کہہ کر انسان کی برتری اور بڑائی کا اعلان کر دیا۔ اور بھلائی اور برائی کے لئے انسان کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔ ۹ ۱۱۱ ۲۹۱۱۸ ۲۰۰۷۴۱

مندرجہ بالا باتوں سے کائنات میں انسان کی حیثیت ظاہر ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ہم ان کو کی پیش رو اور رہنما قرار دے سکتے ہیں۔ امیر خسرو نے اپنے عہد میں قرآنی عمل سے بھرپور استفادہ کیا اور اس کو اپنی شاعری کی زینت بنایا۔

یہاں اس علمی اور تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ آج ہم جس کو جدید یا مغربی تہذیب کہتے ہیں اس کی بنیاد دراصل اسلامی تہذیب ہی پر ہے۔

اسلامی تہذیب نے اپنی ترقی کے زمانہ میں مسلک انسانیت کے تصور کو بڑی حد تک ابھارا۔ اسلامی تصوف کا بھی اس تصور کو نمایاں کرنے اور ترقی دینے میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک روحانی مرتبہ کمال ہی انسانی زندگی کا منتہا ہے۔ تصوف انسان دوستی کی وہ تحریک ہے جس نے انسانوں کے درمیان تمام امتیازات کو ختم کر کے انسان کو محض انسانیت کی بنیاد پر اہمیت دی۔

خسرو نے اپنی شاعری میں انسان کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی بنیاد اسلامی تصوف کی ایک شاخ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پر رکھی۔

امیر خسرو کے نظریات کو سمجھنے اور ان کے مسلک انسانیت کی بنیادوں کی تلاش کرنے کے لئے ہمیں چشتیہ سلسلہ کے مسلک کو سمجھنا ہوگا۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ملفوظات سے اس سلسلہ کی جو نمایاں خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں ان میں انسان دوستی۔ خدمت خلق۔ مذہبی رواداری غیر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ برابری کا سلوک حکومت اور حکمراں طبقہ سے بے تعلقی اور دوری شامل ہیں۔

چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں معاشرتی لحاظ سے پسماندہ طبقات کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز تھیں۔ ان بزرگوں کا مقصد ہی خلق اللہ کی خدمت اور مصیبت زدوں کی اعانت تھا۔ مذہب۔ رنگ نسل یا عقیدے کی کوئی قید نہ تھی۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے سب سے بڑی تبلیغی ضرورت یہ خیال کی کہ عوام سے ربط برقرار رکھا جائے اور حکمراں طبقے نے جو فاصلے قائم کر رکھے ہیں ان کو ہی الامکان کم کیا جائے۔ ضرورت و وقت نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ذریعہ عوامی بولی کو کے ذریعہ کی حیثیت سے رواج دلائی۔ اسی طرح انھوں نے یہ محسوس فرمایا کہ قوالی کے ذریعہ بھی تصوف کے پیام کو عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

چشتیہ سلسلہ کے ایک عالی مرتبت شاہد حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا "وہ شخص اللہ کو دوست رکھتا ہے جس کی سخاوت دریا کی سی سخاوت ہو جس کی شفقت آفتاب کی سی شفقت ہو اور جس کی تواضع زمین کی سی تواضع ہو یعنی بلا لحاظ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہو۔"

جب آپ نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنا جانشین مقرر کر کے دہلی بھیجا تو یہ نصیحت فرمائی۔

"جو تمہارے ساتھ دشمنی کرے اس سے دوستی کا برتاؤ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا"

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا قیام دہلی کے باہر ایک گاؤں میں تھا۔ جو بعد کو کیلوکھری کہلایا۔ آپ نے عوام میں بے حد مقبولیت حاصل کر لی شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو یہ بات ناگوار گزری۔ انھوں نے اپنے قدیم دوست خواجہ معین الدین چشتی سے جب کہ وہ دہلی تشریف لائے تھے اس بات کا خاص انداز سے ذکر کیا خواجہ معین الدین چشتی نے یہ طے کیا کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنے ساتھ اجمیر لے جائیں گے۔ لیکن اہل دہلی نے وہ آہ و بکا کی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مریدان خلفاء حضرت بابا شیخ فرید الدین گنج شکر

ہے۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی اپنے مرید اور خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو نصیحت تھی کہ دشمنوں کو رام کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور حقوق کی ادائیگی میں ہرگز کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ یعنی حق داروں کو ان کا پورا حق دیا جائے۔

حضرت بابا فرید نے فرمایا "نظام الدین تم ایک ایسا درخت ہو گے جس کے سکون بخش سایہ میں لوگ آرام کریں گے"

اسی طرح حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

"عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس کا فائدہ صرف عبادت کرنے والے کو ہوتا ہے جیسے نماز۔ روزہ۔ ذکر و شغل وغیرہ۔ اور دوسری وہ عبادت جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے جیسے دوسروں کے ساتھ شفقت و مہربانی۔ آپس میں اتفاق کروا دینا وغیرہ اس کا ثواب بے اندازہ ہے"

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے گوشہ نشینی زندگی اختیار کی۔ اور فتوحات پر گزارا کرنا شروع کیا۔ آپ نے امیر خسرو کے ذریعہ شیخ نظام الدین اولیاء سے اجازت مانگی کہ کسی گوشہ میں اکیلے عبادت کرنے لگیں لیکن شیخ کا حکم صاف تھا۔ "امیر خسرو! نصیر الدین سے کہہ دو کہ تمہیں خلق میں رہنا اور لوگوں کے ظلم و ستم سہنا چاہئے۔ اور ان کے عوض میں بدل اور ایثار سخاوت کی کوشش کرنا چاہئے"[1]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ طریقہ کار تھا کہ وہ خود اپنی حد تک اصولوں پر سختی سے پابند رہتے تھے اور جن کو اپنا خلیفہ بنانے ان کے لئے بھی سخت اور عملی معیار مقرر تھا لیکن عام معتقدین کی حد تک وہ سہولتیں دینے اور رعایتیں کرنے کے قائل تھے وہ وسیع المشرب تھے ان کے معتقدین میں ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ وہ اپنے ہر معتقد کو خود ان کی اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع دیتے۔ ذاتی صلاحیتوں کی نشوونما پر کسی قسم کا بیرونی اثر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے پیروؤں کو ترک دنیا کی تعلیم دیتے نہ ہی اپنے مشوروں کو ان پر لادتے۔ امیر خسرو کو انسانوں اور انسانیت سے محبت تھی۔ ان کا مزاج عوامی انداز کا تھا۔ وہ فنکار تھے۔ تو ان کو ان ہی کے خطوط پر اپنی شخصیت کی نشوونما کا موقع دیا اور چشتیہ سلسلہ کی عام تعلیمات نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔

حضرت امیر خسرو کا نقطۂ نظر تھا کہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ہر دکھ درد نسخہ بھی وہ درد دل یا سوز سینہ تھا۔ اگرچہ بعض لوگ دل کے معاملہ پر اعلانیہ بحث کرنا ناپسند کرتے ہیں لیکن بعض حضرات میں تصور کرتے ہیں تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں کہ جس پر پیر طریقت کو ناراض ہونا پڑے جس کو وہ اپنا راہ آخرت تصور کرتے۔ اور یہ الہی سوز سینہ ہی "لا یمکن" کی دعا کا راز ہے۔ در اصل یہ سوز خیالات کی دنیا میں آگ لگانے والا تھا۔ سات سو سال بعد آج بھی اس سوز کی چنگاریاں ملتی ہیں جن سے دلوں کو گرمایا جا سکتا ہے انسانیت کے فائدہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

امیر خسرو نے چشتیہ سلسلہ کے اثر کے تحت رواداری۔ روشن خیالی اور انسان دوستی کا علم بلند کیا۔ اور رنگ نسل اور مذہب کے امتیازات کو ذرہ برابر بھی ماں گر انسان کو بحیثیت انسان ... .. . قابل احترام مانا۔ انھوں نے بادشاہوں کے دربار میں رہ کر بھی عام انسان کو اہمیت دی۔ ایسے دور میں جب کہ عوام اور خواص کی تفریق بڑی سخت تھی اور حکمران طبقہ میں شدید احساس برتری پایا جاتا تھا امیر خسرو عوام میں بھی خوبیوں اور صلاحیتوں کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں۔

اگر تو آدمی در کسان منظر میں
کہ بہتر از من و تو بندۂ خدا بہ بد

(اگر تم انسان ہو تو کسی پر طعن و طنز مت کرو کیوں کہ ہزاروں خدا کے بندے ہم تم سے بہتر ہیں)

حکمران طبقہ میں غرور و نخوت اور مذہبی علماء میں ریاکاری اور خود غرضی کو وہ محسوس کرتے ہیں اور جب سادہ لوح عوام سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو عوام ہی ان کو بہتر نظر آتے ہیں۔

بادہ کش در جہاں بہر از یں متقان زاہدان
کز پی آں حلقہ زیں طاعت معبود کنند

(جنت کے لالچ میں عبادت کرنے والے زاہدوں سے دوزخ کا ایندھن بننے والے شرابی بہتر ہیں۔)

حکمران طبقہ سے تعلق رکھتے ہوتے بھی انھوں نے طبقاتی اختلافات کو نظر انداز کیا۔ اپنے ذہن کو احساس برتری سے پاک رکھا۔ محکوم طبقہ کی سنگیت زبان اس کے علوم و فنون کو نہ صرف قدر و طرب کی نگاہ سے دیکھا بلکہ ان میں خود بھی دستگاہ حاصل کی۔ اس تمام تجربہ میں جس کو تاریخ عالم کا نہایت دلچسپ اور انوکھا تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے انسان کی عظمت کو بنیادی اور مرکزی اہمیت دی گئی۔

ہندوؤں کی قدیم ستی کی رسم پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اس میں جو ناانصافی کا عنصر شامل ہے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے امیر خسرو مسلک انسانیت کے اس اونچے مقام پر تھے کہ اس رسم کے کمزور پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں پڑی۔ وہ محض اخلاقی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کو اس رسم میں بھی خوبی ہی خوبی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک سے زیادہ جگہ اس رسم کا ذکر ملتا ہے۔

خسرو در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را
مردن اندر دوستی اے دوست ز ہندو آموز
زندہ در آتش سوزاں شدن آساں نبود
اندر مجلس کہ خود را زندہ سوزد اہل عشق
اے ساغر جدا اکثر از ہندو زنی سنت
گرچہ اسلام روا نیست چنیں
لیک چوں کار بزرگ ست نہ میں

---

[1] حضرت نظام الدین اولیاء ۔ حیات اور تعلیمات از پروفیسر محمد حبیب مرحوم صفحہ ۹

گر بہ شریعت بود این لوح روا
جان دہند اہل سعادت بہ سوا

امیر خسرو کا تصور انسانیت بہت بلند ہے۔ وہ مثالی انسان کو بلند کردار دیکھنا چاہتے ہیں۔

مرد کہ از علم توانگر بود
کے نظرش بر زر و گوہر بود

(جو علم سے بہرہ ور ہو وہ سونے موتی کی طرف کیوں نظر ڈالے)

امیر خسرو کے نزدیک زندگی کا مقصد کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے بلند تر ہے

غرض گر تہ بودے نہ خورد و آشام
خر ان را ہم توان گفتن آدمی نام

امیر خسرو عام آدمیوں کی خوبیوں کو اور سوسائٹی میں جو لوگ بڑے گنے جاتے ہیں ان کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

آشکارا عشق بازی نا ستان
از پس زہد ریائی خوشتر است

(دکھاوے کی عبادت سے وہ عشق بازی بہتر ہے جس میں خلوص ہو)۔
انسان کے اطمینان قلب کے لئے قناعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اگر خواہی نہ بینی رنج بسیار
بہ اندک مایہ راحت باش خرسند

حضرت امیر خسرو عقل و خرد انسانیت کے لئے ضروری تصور کرتے ہیں۔

چو ایں سرمایہ بود با خرد جفت
نہ شاید بے خرد را آدمی گفت

اگر دولت کو عقل سے متحد نہ کیا جائے تو بے وقوف شخص کو انسان کہنا موزوں نہیں۔

پس آنکس مردم آمد از آفرینش
کہ ہستش بر خرد قانون بینش

پس وہ ازل سے صحیح معنوں میں مرد وہی ہے جس کی نگاہ عقل سے منسلک ہو۔
انسانی زندگی مختصر ہے اس لئے اس کو کارآمد بنانا چاہئے اور ضائع نہیں کرنا چاہئے

ضائع مکن نہ خندہ و ناری بسان گل
این پنج روزہ عمر کہ بر باد می رود

مصروف زندگی کو وہ مبارک تصور کرتے ہیں۔

مرد ہمہ جانب سر کار نہ
شخص معطل محل دشوار بہ

آدمی کو چاہئے کہ وہ کاہل بے کار نہ بنے۔

بہرہ مقصود چو بے رنج نیست
کاہل بے کار نہ پیکار بہ

انسان کے لئے خود شناسی ضروری ہے جو خود شناس نہ ہو وہ خدا کو کیسے پہچانے گا۔

آنکہ خود را شناخت نتواند
آفرینندہ را کجا داند؟؟

جب معزالدین کیقباد نے ایک نیا شہر آباد کیا تو امیر خسرو نے اس کا نام "نئی لوک نگری" تجویز کیا۔ اس میں کیقباد کے نام سے عوام کے لئے لوک اور خدا کا نام نگری تجویز کئے گئے یہ نام بعد کو کیلو کھڑی ہو گیا۔ اس سے امیر خسرو کے سوچنے کے انداز پر روشنی پڑتی ہے کہ انہوں نے خدائے حقیقی اور مجازی کے درمیان عوام کو شریک رکھا۔ اور نام عوامی زبان میں تجویز کیا۔

امیر خسرو نے دیباچہ میں حمد، نعت، منقبت حضرت نظام الدین اولیاء اور مدح سلطان علاء الدین خلجی کے بعد شاعری کے دو اسلوبوں کا ذکر کیا۔ جس میں عام آدمی کے اسلوب کو زبان سلیس اور بعید مطلب بیان کیا ہے۔

علاء الدین خلجی دیندار آدمی نہ تھا لیکن جب اس نے رعیت کی خوش حالی کے لئے تاجروں کے استحصال سے غریب رعایا کا بچاؤ کیا اور قیمتوں پر نگرانی کی تو خسرو اس کی تدابیر کو خوش آئند تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ عدل و داد رعیت کو رات سو سال استظار کرنا پڑا تب جا کر اسے ایک بیا مربی ملا۔

امیر خسرو نے درباداری کی اور بادشاہوں کے سامنے مؤدب کھڑے رہتے گزری لیکن ان کا ضمیر ساتھا۔

جو کہو حق کہو جو لکھو حق لکھو مشعل آدمیت کو بجھنے نہ دو۔
اپنے جس ہاتھ میں تھامے ہو قلم تم کو اس ہاتھ کے آبرو کی قسم۔

ان کے اس موقف میں لغزش نہ آئی۔ انہوں نے مشعل آدمیت کو بجھنے نہ دیا۔ جیسے وہ کہتے ہیں۔

با شمع را برائے نفس خود راتبے
پیش چو خودے ستادہ بر پائے

(نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مؤدب کھڑا رہا ہوں)۔

صفدر آہ

امیر خسرو بحیثیت ایک عوامی شاعر

ہندوستان میں باضابطہ عوامی ادب کی ابتدا خسرو ہی سے ہوتی ہے خسرو سے پہلے عوامی زبانوں میں کچھ لوک گیت تھے جن کے بعض اجزا مختلف لسانی حلقوں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن ان گیتوں کے بنانے والے شاعر نامعلوم ہیں۔ جو عوامی ادب باضابطہ طور پر ملتا ہے اس میں سب سے قدیم جین سادھوؤں کے دوہے ہیں جو جین مندروں کے پرانے دفتروں سے برآمد ہوتے ہیں۔ ان دوہوں کی زبان اب کھوئی ہوئی ہے اور ان کی عمر ہزار سال سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہ دوہے کسی خاص شاعر کی شخصیت نمایاں نہیں کرتے بلکہ اس کلام پاشاں سے ایک مخصوص عہد کا ایک مبہم لسانی خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

خسرو سے تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے ایک باضابطہ شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری (۴۳۸ھ سے ۵۱۵ھ تک) ہوتے ہیں۔ خسرو غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں کہ ان کے تین دیوان تھے۔ ایک فارسی میں، ایک عربی میں اور ایک ہندوی میں۔ مسعود سعد سلمان کا فارسی دیوان تو تہران سے شائع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کے عربی اور ہندوی دیوان کا کوئی پتہ نہیں۔ یہ ہندوی دیوان لاہوری یعنی پنجابی میں ہوگا۔ مسعود سعد سلمان بڑے شاعر تھے۔ لیکن وہ کسی سیاسی جرم میں طویل مدت تک قید خانے میں رہے اور شہرت نہ حاصل کر سکے۔

خسرو سے قبل ایک اور شاعر چند بردائی کا نام لیا جاتا ہے جس نے پرتھی راج راسا (یعنی رزمیہ پرتھوی راج) لکھا ہے۔ اسے پرتھوی راج کے دربار کا شاعر بتایا جاتا ہے۔ اب یہ مسلمہ طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ چند بردائی مغلوں کے عہد کے کسی ل پدر راجہ کے دربار کا بھاٹ تھا۔ اس کا زمانہ خسرو سے کئی سو سال بعد آتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ خسرو ہر عشق چشتیہ خانوادے کے آفتاب نیم روز ہیں۔ ہندوستان کے بہترین فارسی شاعر ہیں۔ وہ ہندوستانی سنگیت کے مجدد اعظم ہیں لیکن ان کی عوامی شاعر کی حیثیت ان تمام حیثیتوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان کے سیدھے سادے گیت، ان کی پہیلیاں، ان کی مکریاں، ان کے ڈھکوسلے ہندوستان کے گھر گھر میں سب کی زبان پر ہیں۔ ان کی مکتبی کتاب خالق باری ہے فرہنگ آموزی کی مقبول ترین تصنیف ہے۔

بدقسمتی سے اس صدی کی ابتدا اتنی شدید فرقہ واریت سے ہوئی جس کا نتیجہ آج ہندوستان اور پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ایک طرف اگر ہندی، ہندو اور ہندوستان کا نعرہ لگ رہا تھا تو دوسری طرف ہندی کے لفظ سے نفرت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اردو کے بیشتر محقق صرف ہندی کھڑی بولی ہی کو نہیں تمام دوسری بالعموم ہندی بولیوں کو بھی نامہذب اور گنواروں کی زبان سمجھتے تھے۔ نفرت کا جنون یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ خود خسرو کی ہندوی کو ان کی ذات کے لئے دون مرتبت سمجھا جاتا تھا اور ہر جائز اور ناجائز طریقے پر خسرو کا تعلق ہندوی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ان محققوں کے سرخیل پروفیسر محمود شیرانی تھے۔ علاوہ مضامین کے انہوں نے مولوی عبدالحق کی اعانت سے ایک کتاب حفظ اللسان لکھی ہے جس میں خسرو کی ہندوی اور ان کی مقبول ترین کتاب خالق باری کو غیر مستند ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں شیرانی صاحب کی اس کتاب کے لئے ایک ایک نکتے کا جواب اپنی کتاب امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر میں دے چکا ہوں اور ہند و پاکستان دونوں جگہ اہل علم تبصرہ نگاروں نے بلا استثنا میری تائید کی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خسرو خود اپنی نثر و نظم میں ہندوی شاعر ہونے کے بہ فخر مقر ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے ان کی ہندوی اشعار کی تعداد تین لاکھ ابیات سے زیادہ متعین کی ہے لیکن افسوس ہے کہ اب یہ تعداد تین سو مستند ابیات تک بمشکل پہنچ سکے گی۔

خسرو کا عوامی کلام ضائع ہونے کا سبب یہ ہے کہ عوام اپنے ادب سے لطف تو لیتے ہیں، لیکن اس کی تدوین نہیں کر سکتے۔ عوامی ادب کی تدوین کا کام خسرو کے بہت بعد دوسروں نے شروع کیا۔ مذہبی عوامی ادب کو بھی محفوظ کرنے والے عوام نہیں۔ اسے منظم مذاہب اور مندروں کے مرکزوں نے محفوظ کیا ہے۔

خسرو کے عہد میں زبان کے تین انداز تھے۔

۱۔ وہ شائستہ زبان جو خسرو اور دوسرے مقربین دربار ہندوستانیوں کے گھروں

قبل ۱۱۹۱ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے فتح کیا تھا۔ کیلوکھڑی۔ کیقباد نے جمنا کے کنارے موجودہ ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ کے جانب جنوب ایک میل کے فاصلہ پر ۱۲۸۶ء میں ایک قلعہ بنوایا اور ایک عالی شان قصر تیار کیا۔ جس کے گرد ایک شاہی باغ لگایا گیا تھا کیقباد نے اس محل کا نام کیلوک ہری رکھا۔ یہ نام امیر خسرو نے تجویز کیا۔ بادشاہ نے امیر خسرو سے فرمائش کی کہ محل کا نام ایسا تجویز کیا جائے جس میں اس کی بادشاہی کا اور اس کا ذکر بھی ہو اور جدا کا نام بھی آ جائے اور جمنا دریا بھی آ جائے امیر خسرو نے کیقباد کے عہد کے لوگ یعنی عوام بھی سمجھ جائیں۔ اس طرح کیلوک ہری نام رکھا گیا جو بعد میں چل کر کیلو کھڑی مشہور ہوا۔ ۱۲۸۹ء میں کیقباد کو ترک امراء نے معزول کر کے کیلوکھڑی کے محل میں نظر بند کر دیا۔ جلال الدین فیروز خلجی نے کیلوکھڑی کے پاس شہر آباد کیا تھا کیوں کہ وہ شہر کے رئیسوں سے مطمئن نہ تھے۔ اس نئے کیلوکھڑی میں رہائش اختیار کی اور اس کی ناتمام عمارتوں کو پورا کیا دریا کے کنارے باغ۔ حصار کھنچ اور پتھر سے مسجد اور بازار حاکم شہر آباد کیا اس کا نام شہر نو رکھا امیر خسرو نے اس قلعہ کی تعریف میں قران السعدین میں لکھا ہے۔

قصر عظیم کہ بہشتی فراخ روضہ طوبی دراو فراخ

ایک شہر سری تھا۔ اس کو دار الخلافہ کہتے تھے سلطان علاء الدین اور قطب الدین مبارک شاہ اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک شہر تغلق آباد تھا۔ اس قلعہ اور شہر کو غیاث الدین تغلق نے ۱۳۲۱ء میں امیر خسرو کے آخری دور میں بنانا شروع کیا تھا۔ امیر خسرو کی زندگی ہی میں یعنی ان کی وفات سے دو سال قبل قلعہ اور شہر بالکل تیار ہو گیا تھا۔

عمارتیں

امیر خسرو کے عہد میں دہلی میں جو عمارتیں تھیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

جامع مسجد

اس مسجد کا نام مسجد قوت الاسلام تھا جس کو سلطان قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۱ اور ۱۱۹۶ء کے درمیان بنایا تھا۔ ابتداً یہ چھوٹی سی تھی۔ ۱۲۳۰ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ۲۳ سال قبل سلطان شمس الدین التمش نے شمال اور جنوب دونوں طرف اس کی توسیع کی سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۰ء میں مشرقی جانب توسیع کی اور دروازہ تعمیر کروایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں اس کے لئے لکھا ہے۔

مسجد او جامع فیض الہ

زمزمہ خطبہ او تا بماہ

قطب صاحب کی لاٹھ

یہ مینار مسجد قوت الاسلام کے جنوب مشرقی گوشہ میں جمعہ کی اذان کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کو قطب الدین ایبک نے بنانا شروع کیا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش نے ۶۲۶ ہجری میں اس کی تکمیل کی۔

مقبرہ شمس الدین التمش

قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس یہ مقبرہ ہے یہ مقبرہ غالباً سلطانہ رضیہ نے بنوایا تھا اس مقبرہ کی عمارت باہر سے سنگ خارا کی ہے اور اندر سے سنگ سرخ کی۔ کہیں کہیں سنگ مرمر بھی لگا تھا۔ تمام دیواروں پر آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اور پچی ... کاری کی ہوئی ہے۔

حوض شمسی

قطب صاحب کے نواح میں سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۲۹ء میں یہ حوض بنایا۔ حوض سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کا طول دو میل اور عرض ایک میل تھا۔ امیر خسرو نے اس کی تعریف قران السعدین میں یوں کی ہے۔

در کمر سنگ مسلسل دو کوہ آب گہر صفوہ در باشکوہ

اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا اور اہل شہر اس کا پانی پیتے تھے شہر کی عیدگاہ بھی اس کے قریب تھی۔ جب حوض کے کنارے سوکھ جاتے تو ان میں ککڑی، خربوزے اور تربوز بو دیے جاتے۔

حوض خاص

یہ حوض سلطان علاء الدین خلجی نے بنوایا تھا۔ یہ حوض حوض شمسی سے بھی بڑا تھا اس کے گرد اہل طرب رہتے تھے۔

پرانا قلعہ

راجہ اننگ پال نے ۱۰۵۲ء میں گدی نشین ہوا اس قلعہ کی تعمیر کی۔ اس کے دروازہ پر پتھر کے دو شیر بنے ہوئے تھے۔ جن کے پہلوؤں میں کانسہ کے گھنٹے لٹکائے گئے تھے۔ جو بھی رات دن تک اپنی فریاد لے جانا چاہتا ان گھنٹوں کو بجاتا۔ یہ شیر امیر خسرو کے عہد میں موجود تھے۔

قلعہ رائے پتھورا

رائے پتھورا نے ۱۱۴۳ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ۱۱۰ سال قبل یہ قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ ایک عرصہ تک بادشاہوں کا دار الخلافہ رہا۔ سلطان شمس الدین التمش اس قلعہ میں رہتے تھے۔ کیلوکھڑی کے پاس نیا شہر آباد ہوا تو یہ قلعہ پرانی دہلی کے نام سے مشہور ہوا۔

قصر سفید

قلعہ رائے پتھورا میں سلطان قطب الدین ایبک نے ایک محل بنایا اور اس کا نام قصر سفید رکھا۔ اس قصر میں سلطان ناصر الدین محمود تخت نشین ہوئے۔ ۱۲۴۰ء میں جب کہ خسرو کی عمر ۷ سال کی تھی ہلاکو خان کے سفیر نے بھی اس قصر میں منعقدہ ایک دربار میں شرکت کی۔

بازار سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا بازار چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی اس قصر میں تخت نشین ہوئے۔

مسجد میری

سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے جامع مسجد جس کو مسجد میری کہتے تھے تعمیر کی۔ علماء اور مشائخ کو انھوں نے دعوت دی کہ جمعہ کی نماز اس میں پڑھیں۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے کیلوکھڑی کی مسجد میں نماز جمعہ کے لئے جایا کرتے تھے یہ کہلا بھیجا کہ جو مسجد میرے مکان سے قریب ہے اس کا حق ارجح ہے۔

کوشک لال

سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے بنایا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اسی کوشک کے پاس عمارات پوربنایا جو قلعہ مرغن سے مشہور ہوا۔ یہ اسی لواح میں تھا۔ جہاں حضرت نظام الدین اولیا کا مزار ہے۔ جلال فیروز خلجی کو کیلوکھڑی سے لاکر پرانی دہلی کے تخت پر بٹھایا گیا تو وہ وہاں سے کوشک لال آئے اور سلطان غیاث الدین بلبن کو یاد کرکے اس کے دربار کے سامنے پیادہ پا ہوتے۔ جلال الدین فیروز خلجی اکثر اس کوشک میں رہتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کوشک سیری بنانے سے قبل اسی کوشک میں رہتے تھے۔

کوشک لال (نیا شہر)

دوسرا کوشک لال سلطان فیروز خلجی کا بنایا ہوا ہے۔ جو کیلوکھڑی میں تھا امیر خسرو نے اس کوشک کی تعریف میں لکھا۔

ستونہا زرشیہ توگردے حصارے
سر رفت از کنگرہ ہا تا قصر سنگ

کوشک سبز

جلال الدین فیروز خلجی نے کوشک لال سے قریب ایک اور محل کوشک سبز بنایا تھا۔ جب اس کو قتل کیا گیا تو اس کے فرزند رکن الدین ابراہیم شاہ کو اسی کوشک میں تخت پر بٹھایا گیا

قلعہ علائی (کوشک سیری)

یہ قلعہ سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۲ء میں بنوایا۔

قصر ہزار ستون

علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۲ء میں بنوایا۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق نے خسرو خاں پر فتح پائی تو اس قصر میں آکر سلطان قطب الدین اور اس کے بھائیوں کی تعزیت ادا کی۔

بازار

دہلی کے بازار بڑے بارونق تھے۔ امیر خسرو تحفۃ الصغر میں کہتے ہیں۔

"اس کے بازار میں آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی" دہلی میں زر و سیم کی کثرت تھی۔ امیر خسرو اعجاز خسروی میں کہتے ہیں۔

دریں شہر سر خری زری می کشد می رود

بازاروں میں بیرونی ممالک کا سامان بھی ملتا تھا۔ اور دور دراز سے تاجر سامان تجارت لے کر یہاں آتے تھے۔ غیر ملکی تاجروں کے خلاف امیر خسرو نے ایک عرضداشت لکھی کہ یہ تاجر دوسرے ممالک سے سرمایہ حاصل کرکے نفع استحصال کرکے نہیں آتے ہیں سلطان علاء الدین خلجی نے ملتانی سوداگروں کی ایک کمپنی یا کارپوریشن بنائی تھی اور قیمتی کپڑے لانے کا کام ملتانی سوداگروں کے سپرد کیا تھا۔ ان کو سلطنت سے تجارت کے لئے ایک معقول رقم بھی ملتی تھی۔ ان کو سونے کے ٹکے دیئے جاتے تھے۔ کیوں کہ ان تاجروں کو سلطنت دہلی کے باہر سے سامان لانا پڑتا تھا۔ جہاں ان سے کشمش اور بادام بھی اس زمانہ میں درآمد ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں ساہوکاروں کا طبقہ تھا جو زیادہ تر ہندو تھے۔ دہلی کے امراء اکثر ان کے مقروض رہتے تھے ان کے سود کی شرح دس فی صدی سالانہ تھی۔

سکے

ہندوستان میں روپیہ کا استعمال شیر شاہ کے وقت سے ہوا۔ ہندوستان کا قدیم سکہ تنکہ تھا۔ امیر خسرو کے عہد میں تنکہ سرخ۔ تنکہ سفید اور جیتل رائج تھے۔ تنکہ سرخ خالص سونے کا سکہ تھا جو ۱۰ رتی اور بعض اوقات ۱۱۲ رتی کا ہوتا۔ تنکہ سرخ کا استعمال زیادہ تر بیرونی تاجر کرتے تنکہ سفید خالص چاندی کا سکہ تھا جو ۸ رتی اور ۱ رتی کا ہوتا بازار میں خرید و فروخت میں جیتل استعمال ہوتا ایک تنکہ سفید کے ۶۴ جیتل ہوتے۔ ششگانی اور ہشتگانی تنکے رائج تھے جو علی الترتیب چھ جیتل اور ۸ جیتل کے ہوتے۔

سلطان غیاث الدین بلبن اور جلال الدین فیروز شاہ کے زمانہ میں طلائی اور نقرئی سکوں پر ایک جانب خلیفہ عباسی مستعصم کا نام "الامام مستعصم امیر المومنین" اور دوسری طرف علی الترتیب "السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین ابو المظفر بلبن السلطان" اور "السلطان الاعظم جلال الدنیا والدین ابو المظفر فیروز شاہ السلطان" منقوش ہوتا تھا۔ البتہ علاء الدین خلجی کے سکوں پر خلیفہ عباسی کا نام نہ ہوتا تھا ایک طرف "یمین الخلافت ناصر المومنین" اور دوسری طرف "علاء الدین خلجی" منقوش تھا۔

اوزان اور پیمانے

اس زمانے کا من ۴۰ سیر کا ہوتا تھا لنکس فرشتہ کے مطابق علاء الدین خلجی کے عہد میں "من آں وقت چہل سیر بود و ہر سیر بیست و چہار تولہ" اگر ۸۰ تولہ کا سیر قرار دیا جائے تو ۱۲ سیر کا من ہوا۔

ختم ہو جاتے تو خطیب نماز پڑھاتا اور خطبہ پڑھتا۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے گھروں کو واپس جاتے۔

ستی

ستی ہونا واجب نہیں تھا۔ اگر کوئی بیوہ عورت ستی ہوتی تو وہ اپنی وفاداری جاتی اور اس کا حال بلال معتبر مانا جاتا۔ جو عورتیں ستی نہیں ہوتیں ان کو موٹے کپڑے پہنے پڑتے اور طرح طرح کی خواری میں زندگی بسر کرنی پڑتی۔ جب کوئی عورت اپنے شوہر کے مرنے پر ستی ہونے کا ارادہ کرتی تو وہ سولہ سنگار کرتی اور اس کو گھوڑے پر سوار کیا جاتا۔ لوگ اس کے پیچھے چلتے آگے ڈھول بجتی۔ رسم بھی ساتھ ساتھ چلتے۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر جلایا نہ جا سکتا تھا۔ لیکن یہ اجازت دے دی جاتی۔ امیر خسرو کو اس رسم میں ہندوستان کی عورت کی وفاشعاری نظر آتی ہے جو انھوں نے یوں ظاہر کیا ہے۔

خسروا در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش
کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

شادی بیاہ کے رسوم

امیر خسرو کے عہد تک تو دارالمسلمانوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور مقامی آبادی سے ان کا میل جول بڑھ گیا تھا جس کے نتیجے کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کے عناصر کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے مذہبی رسوم اور تہواروں کو اپنانے میں دشواری محسوس کی لیکن شادی بیاہ کے رسوم کو آسانی سے اور ابتدائی دور ہی میں اپنا لیا تھا۔ مثنوی دولرانی خضر خاں میں امیر خسرو نے جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے علاوہ سارے رسوم ہندوستانی تھے۔

انتظام سلطنت

امیر خسرو کے عہد میں سلطان اقتدار اعلیٰ کا مالک تھا۔ وہی قانون کا منبع اور سرچشمہ تھا۔ مقدمات کے آخری مرافعے وہی سماعت کرتا۔ اور وہی فوج کا چیف کمانڈر ہوتا۔ البتہ سلطان مذہبی امور میں علما سے مشورہ کرتا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں شریعت کے احکام کی پابندی ضروری تھی۔ امور سلطنت میں سلطان مجلس وزرا (مجلس خلوت) سے مشورہ کرتا۔ ایسا مشورہ سلطان کے لئے لازمی نہ تھا لیکن اکثر سلطان مشورہ ضرور کرتے۔ سلطان عموماً تین چار امرا سے مشورہ کرتا۔ مجلس خلوت میں وہی شریک کئے جاتے جنھیں سلطان طلب کرتا۔ کوئی حق کی بنا پر شرکت کا ادعا نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانہ میں سلطنت کی تشکیل میں عرب، ایرانی کے افکار کا امتزاج تھا۔ اور فوج کی ترتیب ترک و منگول طرز پر تھی۔ طریقہ مال گزاری ہندوستانی تھا۔ اس زمانہ میں دربار دو قسم کے تھے۔ بار عام اور بار خاص۔ بار خاص میں خان، ملک اور امرا شریک ہوتے۔ بار عام میں ہر کوئی شریک ہو سکتا تھا۔ بار عام کا انتظام امیر حاجب کے ذمہ ہوتا۔ اور عوام کی درخواستیں سلطان کو پیش کرتا۔ نائب حاجب اور حاجب اس کو فرائض کی تکمیل میں مدد دیتے۔ جب کوئی شخص دربار میں جاتا تو حاجب اس کو آداب دربار سے واقف کرواتے۔ اور اس کو ہاتھ پکڑ کر ایک خاص مقام پر لے جاتے۔ وہاں سے تعظیم بجا لاتے۔

باربک Lord Chamberlain کے مماثل عہدہ تھا۔ دربار میں مختلف درجہ کے لوگوں کے مقام کا تعین کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

وزیر سلطان کی عدم موجودگی میں کاروبار سلطنت انجام دیتا۔ اس زمانہ میں محکموں کو دیوان کہتے۔ مثلاً دیوان اشراف (محکمہ آڈٹ) دیوان کوہی (محکمہ زراعت) دیوان عرض (محکمہ فوج) دیوان انشاء۔ دیوان عمارت۔ دیوان وزارت (محکمہ مالگزاری) وغیرہ۔ اور محکمہ کے صدر کو مالک کہتے مثلاً مستوفی ممالک (آڈیٹر جنرل) نائب ممالک (وزیر جنگ) عرض ممالک وزیر فوج یہ سپہ سالار ہوتا لشکر سپاہیوں کا تقرر اور ان کی تنخواہوں کی تقسیم اس سے متعلق تھی۔ قاضی ممالک (چیف جسٹس) بڑے محکموں کے علاوہ کارخانہ جات بھی ہوتے۔

چند عہدوں کے نام یہ تھے۔

صدر جہاں (قاضی القضات) ایک مرکزی افسر تھا جس نائبوں کے ذریعہ یہی مولانا (علماء کی مدد معاش مساجد کی تعمیر اوقاف کے انتظام وغیرہ) کا ذمہ دار ہوتا۔

کوتوال شہر میں پولیس کا اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔

خریطہ دار جس کے پاس بادشاہ کا قلمدان ہوتا۔

مہردار۔ بادشاہ کی مہر رکھتا تھا۔

شرابدار۔ بادشاہ کے استعمال کے پانی اور دیگر مشروبات کا منتظم ہوتا تھا سلطان علیٰ شراب نہیں پیتے تھے لیکن اس عہدہ کا نام نہیں بدلا۔

چاشنگیر۔ دسترخوان پر لانے سے پہلے ہر ایک کھانے کو چکھتے اور ان کی محافظت میں بادشاہ کے روبرو لانے کا کام اس سے متعلق ہوتا تھا۔

میرداد۔ یہ عہدہ دار قاضی کے ساتھ بیٹھتا۔ اگر کوئی شخص امیر یا بڑے آدمی پر نالش کرتا تو وہ اس کو قاضی کے روبرو حاضر کرتا۔ اس عہدہ کو ذمہ دار سرکار کے مماثل قیاس کیا جا سکتا ہے۔

دوات دار۔ جس کے پاس بادشاہ کی دوات رہتی۔

شیخ الاسلام صرف ایک لقب تھا جو بادشاہ کی طرف سے ملک کے سب سے بزرگ شیخ کو دیا جاتا تھا۔ لیکن شیخ الاسلام کی بزرگی کا اعتراف کرانا یا اس کو رد کرنا مسلم ملت کے ہاتھ میں رہتا۔

امیر خسرو کے عہد میں سرکاری خزانہ سے رقومات کی ادائیگی خط حوالہ کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اس چٹھی میں یہ درج ہوتا تھا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ خزانہ سے فلاں شخص کو فلاں واجب کی تنخواہ یا اس قدر رقم ادا ہو۔ اس چٹھی پر پہنچانے والا اور جس کی بابت یہ رقم ادا کرنا لکھا ہو ہر دو دستخط کرتے۔ اس کے علاوہ میں امیروں کے دستخط ہوتے۔ پھر ذیلدار وزارت کے پاس لے جاتے۔ متصدی اس کی نقل لے لیتے جو رجسٹر میں لکھا جاتا جس پر وزیر خزانچی کو حکم دیتا۔ خزانچی اسے حساب میں درج کرتا۔ ہر دور کے پروانوں کا چٹھہ بادشاہ کے سامنے پیش کرتا جس کے لئے بادشاہ کا حکم ہوتا کہ فوراً دیدو اسی وقت دے دیا جاتا۔ بعض دفعہ دو دو تین تین سال بعد ملتا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ جس قدر انعام کا حکم دیا جاتے اس کا دسواں حصہ یعنی عشر وضع کر کے بقیہ رقم ادا ہوتی۔

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

بڑو جہ خسرو آ بہ تذکرہ شکر دادم
کہ کام طوطیِ ہندوستاں شود شیریں

ہندوستان، جنت نشان، ابتدا سے صدہا سپہ سالاروں اور دلیروں کا مسکن، رشیوں ورمنیوں کا استھان، دانشوروں اور مفکروں کا مرکز، معلموں اور فلسفیوں کا مخزن اور ادیبوں اور شاعروں کا معدن رہا ہے۔ اس خاک پاک نے ایسے ایسے خلاق معانی پیدا کئے جو نہ صرف اپنے زمانے میں منفرد و یکتا تھے، بلکہ آج تک دنیا ان کا ثانی نہیں پیدا کر سکی۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

حضرت امیر خسرو خلاق معانی بھی تھے اور غواص معانی بھی۔ ان کا شمار ہندوستان کی باکمال ہستیوں کی صف اول میں کیا جاتا ہے۔ وہ علم و فن اور فضل و کمال کی مجسم تصویر تھے۔ ان کی ہمہ گیر اور دلکش شخصیت نے ایک عالم کو شیدائی بنا لیا تھا۔ امیر و غریب، شاہ و گدا، رند و پارسا، ہندو و مسلمان، سب ان کے شیدائی، بڑے بڑے جلیل القدر اور عظیم المرتبت سلاطین ان کی قدر و منزلت کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ ان کے سرمدی نغمے اور میٹھے بول لوگوں کے دلوں میں کیف و سرور پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری معرفت و تصوف کا گنجینہ ہے۔ ان کے ہندی بول، برہم اور گیان کا آئینہ، فیروزی رنگین، لیکن اس باکمال انسان اور صوفی شاعر کے کلام کی ناز کی اور دلکشی کم نہیں ہوئی۔

مادرِ ہند کا یہ قابل فخر اور نامور فرزند تیرہویں صدی عیسوی (۱۲۵۳ء) میں بمقام مومن پور پٹیالی ضلع ایٹہ، اترپردیش میں پیدا ہوا۔ یہ روایت مشہور ہے کہ پدر بزرگوار امیر سیف الدین محمود، نومولود کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہاں کے ایک صاحب حال بزرگ کی خدمت میں لے گئے۔ بچہ کو دیکھتے ہی ان بزرگ نے فرمایا۔

"یہ لڑکا عارف باللہ اور یگانۂ روزگار ہوگا۔ قیامت تک اس کا نام باقی رہے گا، اور وہ قدم خاقانی سے آگے بڑھ جائے گا۔" اس کے بعد دعا دی کہ "اللہ تعالیٰ اس کو ہر دلعزیز کرے۔"

بزرگ محترم کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ نومولود نہ صرف عارف باللہ اور یگانۂ روزگار ہوا۔ بلکہ صاحب سیف و قلم بھی ہوا۔ اس نے علم و ادب کے دریا بہا دیئے۔ اس نے فن موسیقی میں اضافہ کر کے اس کو دلکشی اور رعنائی عطا کی۔ اس کی شیریں سخنی اور نواسنجی نے اسے "طوطیِ ہند" بنا دیا۔

امیر سیف الدین محمود چار سال کے بعد خسرو کو پٹیالی سے دہلی لے آئے۔ یہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا۔ ابھی وہ نو برس ہی کے تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خسرو کے معصوم اور ننھے دل پر جو بیتی اس کا اظہار انھوں نے برجستہ اس غم انگیز شعر میں کیا۔

سیف از سرم گزشت و دلم دو نیم ماند
دریا نے من رواں شد و در یتیم ماند[1]

باپ کی وفات کے بعد خسرو کے نانا، نواب عماد الملک نے اپنے اس ہونہار نواسے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ نواب عماد الملک بڑے پایہ کے امیر تھے۔ ان کی امارت و سخاوت اور علمی سرپرستیوں کا شہرہ دور دور تک تھا۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء ان سے وابستہ تھے۔ ان کی مجلس میں ہر علم و فن کے ارباب کمال شریک ہوتے۔ علم و فضل و کمال کا ایک چشمہ تھا جو ہر وقت جاری رہتا اور جس سے تشنگان علم و فن اپنے کام و دہن سیراب کرتے رہتے۔ شیخ المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا قیام بھی نواب صاحب کے یہاں اکثر و بیشتر رہتا۔ خسرو کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں علم و فضل، مذہب و تصوف کا ایسا صاف ستھرا اور پاکیزہ ماحول ملا۔ بزرگ نانا کی شفقت اور اس پاکیزہ ماحول کی برکت سے خسرو کی فطری ذہانت اور خداداد صلاحیت کی جلا ہوئی۔ انھوں نے کم سنی ہی میں تمام مروجہ علوم و فنون، فقہ، حکم

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال بعض تحوالی میں مذکے ہیا ہے قدر سو۔

صرف ونحو، فلسفہ، منطق، ادب، تاریخ وغیرہ میں کمال حاصل کرلیا۔ مذہب وتصوف، شریعت وطریقت کے وہ سالک ہوگئے۔ موسیقی میں اختراع و ایجاد سے شہرۂ آفاق ہوئے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی ایسا علم وفن ہو جس پر انھوں نے دسترس حاصل نہ کی ہو۔ وہ بہت سی زبانیں جانتے تھے۔ ترکی، فارسی تو میراث کی مادری زبانیں ہی تھیں۔ عربی پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں سے واقفیت تھی سنسکرت میں بھی مہارت تھی۔ لیکن انھیں ہندوی (ہندی) سے بہت لگاؤ تھا ہندوی زبان کے جاننے پر وہ فخر بھی کرتے تھے۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

ہندوی میں شعر گوئی طرۂ امتیاز سمجھتے ہے

"چو من طوطی ہندم راست پرسی
زمن ہندوی پرس تا نغز گویم"

اس طوطی ہند کی روانی ہر وقت، ہر جگہ شعر کے سانچے میں ڈھلتی رہتی تھی دس سال کی عمر سے ہی عروس سخن کے گیسو سنوارنے میں ایسا کمال حاصل کرلیا تھا، اور اتنی جلد بامعنی شعر موزوں کرلیتے تھے کہ لوگ حیرت زدہ ہوجاتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن ہی میں خواجہ عزالدین نے امتحاناً چار غیر متناسب الفاظ، موۓ بیضہ، تیر اور خربزہ، نظم میں موزوں کرنے کے لئے دیئے۔ خسرو نے برجستہ یہ رباعی کہی۔

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است
صد بیضۂ عنبریں برآں موئے ضم است
چوں تیر مداں راست دلش زیرا
چوں خربزہ دندانش میان شکم است

"یہ سن کر خواجہ کو سخت تعجب ہوا۔ انھوں نے خسرو کی بے حد تعریف کی اور دعائیں دیں۔

خسرو کی شاعرانہ فطرت میں علمی وادبی ماحول نے چار چاند لگا دیئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضری نے خلوص، صداقت، درد واثر اور سوز وگداز عطا کیا۔

امیر خسرو نے بڑی عمر پائی۔ انھوں نے غیاث الدین بلبن سے لے کر غیاث الدین تغلق کے زمانے تک گیارہ سلاطین کا زمانہ دیکھا۔ بادشاہوں کا عروج وزوال یکے بعد دیگرے کئی خاندانوں کی حکومت، سب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن ان کی علمیت وقابلیت، دانشمندی وذہانت اور ان سب سے بڑھ کر ان کی روحانی [illegible] تھی کہ ہر سلطان نے انھیں عزت واحترام کے قابل سمجھا اور ان سے سابقہ رکھنے میں سعادت وشرف کا باعث سمجھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خسرو بے لوث انسان تھے۔ یکتائے روزگار تھے۔ روحانیت کے تاجدار تھے۔ سیاست سے واسطہ نہیں رکھتے تھے، امور سلطنت میں دخل دینے اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اپنے عادات وخصائل کے اعتبار سے وہ مجسمۂ شرافت وانسانیت تھے۔ ان کی شخصیت ہشت پہلو نگینہ کی طرح ہے۔ ان جیسا صاحب کمال، ظاہری وباطنی علوم کا ماہر، مرجع خلائق، ہر دلعزیز، بے تعصب، نیک اور پارسا، وہ حق صفات حسنہ کا مجموعہ صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں امیر خسرو۔

"امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار، شعر وادب کے دیوان اس کی ادبی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبۂ روحانی سے آگاہ، سر شام آجائے تو محفل اسے پائے، خاندان چشت اہل بہشت کے کوچے میں آنکلے تو حلقۂ ذکر وفکر میں سرِ مسند جلوہ اس کا دیکھے اچھے اچھے شیخ اس کا دم بھر رہے ہیں۔ معرفت وطریقت کے حرف شناس کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں[1]"

خسرو کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی حب الوطنی ہے۔ اپنے وطن ہندوستان سے انھیں بے پناہ اور والہانہ محبت تھی جس پاکیزہ ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے جن بزرگوں کی صحبت سے وہ مستفیض ہوئے تھے ان کا نعرہ بھی یہی تھا کہ وہ وطن کی محبت کو اپنا ایمان سمجھیں۔ اور ہے

خاک وطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل وریحاں خوشتر

کو حرمان نصیب شاعری کی طرح وطن کی محبت بھی خسرو کی طبیعت میں طوفان اضطراب بپا کئے رہتی تھی۔ انھوں نے ہندوستان اور اس کی ایک ایک چیز کی جتنی اور جیسی تعریف اور بڑائی کی ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اس عقیدت کے ساتھ لکھی ہو۔ انھیں یہاں کے ذرّہ ذرّہ اور چپّہ چپّہ سے عشق تھا۔ وہ ہندوستان کو تمام دنیا سے بہتر اور افضل سمجھتے تھے یہاں کے انسان، مذہب، رسم ورواج، طور وطریق، زبان، لباس، عمارتیں، باغات، چمن، میوے، پھل، پھول، پرندے، جانور، دریا، پہاڑ، سبزہ زار، میدان، غرض ہر چیز ان کی نظر میں تمام دنیا سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔ اپنے وطن اور وطن کی ہر چیز سے یہ والہانہ محبت اسی کو ہوسکتی ہے جو سچا محب وطن ہو۔ جسے اپنے وطن کے بنانے اور سنوارنے کی دھن ہو۔ جو اس کی تعمیر وترقی، فلاح واصلاح کا دل سے خواہشمند ہو۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے خسرو کی حیات، ان کے خیالات اور کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کے وہی ایک ایسے اور پہلے سپوت نظر آتے ہیں جنھوں نے مادر وطن کی عظمت وفضیلت کو دلائل وبراہین سے ثابت کردیا کہ خطۂ ارض پر ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کی بارش کی ہے اور جس کو ہر قسم کی دولت اور خوبی سے مالامال کیا ہے۔

یوں تو ارباب حکومت اور سلاطین سے وابستگی کی وجہ سے وہ ہندوستان

---

[1] عبدالماجد (ص ۱۹-۲۱۸)

کے مختلف مقامات پر جاتے رہے اور وہاں کے حالات و کوائف سے واقفیت حاصل کرتے رہے لیکن ان کا مستقر دہلی رہا وہ دہلی ہی پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ اس لئے قدرتاً انہیں دہلی اور دہلی والوں سے زیادہ محبت تھی۔ دہلی کی تعریف میں ان کا تمام زور قلم و نشاط انگیز ہو جاتا ہے۔ قران السعدین میں لکھتے ہیں کہ دہلی اپنی صفات اور خصوصیات میں باغ ارم کی طرح ہے۔ عدن کی جنت ہے۔ انتہا یہ ہے کہ خسرو نے دہلی کو مکہ معظمہ سے بھی زیادہ محترم بتایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"اس بوستاں کا قصہ سن کر مکہ بھی اس کا طواف کرنے لگے"

یہاں کی آب و ہوا، محصول، میوے، باغات، عمارتوں اور باشندوں کی تعریف کی ہے۔

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است کہ آباد باد
گر شنود قصہ این بوستان
مکہ شود طائف ہندوستان[1]

عمارتوں میں قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، حوض شمسی، قصر ہو کی تعریف کی ہے۔ اسی طرح مرداں و تباں ساوہ دہلی کے لئے لکھتے ہیں

مردم او جملہ فرشتہ سرشت
خوش دل و خوش خوئے چو اہل بہشت
بیشتر از علم و ہنر بہرہ مند
و اہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

چوں ز سخن بگذری آہنگ و ساز   نغمۂ مرغان بر ستم نواز
و از ہمہ بیرہ و پیکان و تیر   ہر کہ در آید بہ نظر بے نظیر[2]

خسرو نے ہندوستان کی عظمت و فضلیت کے اسباب بھی بتائے ہیں کہ اسے دنیا کے تمام ملکوں پر کیوں برتری اور بڑائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ میں ہندوستان کو روم، خراسان، ختن، عراق و خطا سے کیوں بہتر سمجھتا ہوں جو صاحب انصاف ہیں وہ میری تعریف کرتے ہیں لیکن جو کینہ پرور اور حاسد ہیں وہی نفرین کرتے ہیں۔"

منصف دانندہ بہ تحسین کشدش   حاسد پر کینہ بہ نفرین کشدش

خسرو کے نزدیک ہندوستان کی ترجیح کے دو نمایاں اسباب ہیں:

دو ہم باعث این کار شدہ   کاں دو سبب حجت گفتار شدہ
آں ست یکے کیں زمین از دور زمن   ہست مرا مولد و ماوی و وطن
دیں ز رسول آمدہ کای بہرہ دیں   حب وطن ہست ز ایماں بہ یقیں
من ہمہ تکرار از پیار روی علم   گر وطنے ہست ترا گوئی تو ہم
دومش آں کیں زمیں قطب نشاں   ہست چو راغ زہمہ ملک جہاں
گرچہ کہ ترجیح بہ راج نہ روا   از پئے تاکید شد این بانگ و نوا

حضرت چو دہلی اد م چو بر دوں   باں بحر کنوں روش سحر و فسوں[3]

وہ اسی پر بس نہیں کرتے وہ ہندوستان کی فضلیت علوم و فنون کی مرکزیت ایجادات، نغمہ و سرود اور دوسرے کمالات کی وجہ سے بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کم از کم دس خوبیاں ایسی ہیں جن میں ہندوستان یکتائے زمانہ ہے:

(۱) پہلا سبب یہ ہے کہ یہ ملک علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ہمیشہ علم کی اتنی فراوانی رہی ہے کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اولش آں شد کہ دریں ملک درون   علم ہمہ جاست ز اندازہ فزوں
لیک دگر جائے ندارند حسر   راہ کہ در ہند علوم است و ہنر

(۲) دنیا میں ہندوستانیوں ہی کی یہ صفت اور خصوصیت ہے کہ وہ ہر زبان کو آسانی کے ساتھ سیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ دوسرے ملکوں کے باشندے اس خوبی سے محروم ہیں وہ نہ تو یہاں (ہندوستان) کی زبان اتنی جلد سیکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔

ہست دوم آنکہ ز ہند آدمیاں   جملہ بگویند زباں ہا بہ بیاں
لیکن از اقصائے دگر ہیچ کسے   گفت نیارد سخن ہند بسے
رہرو ما باشد دگرے راز گہے   از سر قوت کند ایں سو نگہے

(۳) دنیا میں ہندوستان ہی صرف ایسا ملک ہے جو ہمیشہ سے علوم و فنون کا مرکز رہا۔ دنیا کے چپہ چپہ سے لوگ یہاں علم حاصل کرنے کے لئے آتے رہے ہیں۔ کسی ہندوستانی کو کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ تحصیل علم کے لئے باہر کسی دوسرے ملک میں جائے۔

حجت سوئم شنو از من بہ خرد   کاں ز رہ عقل بدولت اندر رد
کایں طرف از ہر طرفے اہل ہنر   در طلب علم و ہنر کردہ گزر
لیک بہ تحصیل حکم برہمن   از ہند نہ شد ایچ طرف

(۴) ہندوستان ہی کو یہ فخر و شرف حاصل ہے کہ وہ علم ہندسہ، ریاضی اور صفر کا موجد ہے۔

حجت چارم رقم ہندسہ ہیں   کاہل جہاں وضع ندیدند چنیں
ہم سے یکے صفر کہ نقشے است تہی   بس چہ رموز است خوش طلیت مہی
علم ریاضی کہ خرد شد خوش ازو   وضع مجسطی شد و اقلیدس ازو
آں ہمہ علم و عددش زیر و زبر   بر سر رقم ار نیست خط صفر قمر
چوں ملکا حملہ ار وحشت مدد   پس ہمہ شاگرد برہمن بہ عدد

(۵) کلیلہ دمنہ جیسی مفید، دلچسپ اور بے مثل کتاب نہیں لکھی گئی جس سے تمام دنیا مستفید ہوئی ہے۔

حجت پنجم بہ بیاں شرح کنم   مدعیاں را نہ جرح کنم
دمنہ کلیلہ ز دو و دام سخن   دانکہ ہم از ہند شد است کہن
حکمت از ینجا بہ چہ بود کز ہمہ سو   سوئے تو آرند حکیماں ہمہ رو

(۶) علم و فن ہی نہیں ہندوستان نے ایسے ایسے کھیل ایجاد کئے ہیں جو انسان کے ذہن و دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ اور اس کا غم غلط کرتے ہیں:

۱؎ قران السعدین ص ۲۸ تا ۳۲ ۲؎ قران السعدین ص ۲۸ تا ۳۲ ۳؎ حال ہند مثنوی نہ سپہر ص ۱۴۹ تا ۱۵۱

چھٹی حجت یہ ہے کہ ہندوستان میں انواع و اقسام کی نعمتیں پائی جاتی ہیں۔ دنیا کا کوئی خطہ اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ ان نعمتوں نے اس کو رشکِ جناں بنا دیا ہے۔

ہشت ششم حجتم کایں ہست حر   راحد مرسل؟ - تحقیق سحر
نعمت دنیا کہ بہ آمیزش سزا   از پے گبراں است بہشتی جزا
بس ہمہ حال رحول و ہی   ہند بہشت است باتیات رہی

ساتویں حجت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک تمام دنیا ایک قید خانہ ہے لیکن ہندوستان کو وہ بھی خلد بریں سمجھتے ہیں۔

حجت ہفتم شنو اس محکم وبر   بیش تو آراستہ چوں رشتہ بدر
کانچہ در ہند مسلمانست بہ حق   ما یتعلق از ابرجانست رمق
گرچہ کہ بر نسبت فردوس نہاں   با ہمہ لطفیش چو زندان است جہاں
لیک بہ ہند است سبیلش دگر   کانش در ولایتی و بدار حسب اثر
زاں سبب خاص را صحاب نقیل   ہند تواں گفت کہ خلد است بر سبیل[1]

خسرو نے دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان دنیا کی جنت ہے۔ پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور ساتویں حجت مذہبی حیثیت رکھتی ہیں اور پانچویں، چھٹی دنیوی جس میں ہندوستان کی پیداوار اور نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔

کسی ملک میں انواع و اقسام کی پیداوار نعمتیں، اس کی بہترین زمین، موسم، اور آب و ہوا پر منحصر ہے۔ خسرو نے اس اعتبار سے بھی ہندوستان کا جائزہ لیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے بدلائل ہندوستان کو جنت ثابت کیا ہے۔ اب میں اس کی آب و ہوا کی خصوصیات بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اس حیثیت سے بھی ہندوستان اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ خراسان اور دوسرے ممالک سے دس اسباب کی بدولت یہاں کی آب و ہوا بہتر اور مفید ہے۔

ہند چو فردوس شد از حجتم   بہر ہوایش کنوں آیم بہ سخن
دہ شمرم حجت قاطع کہ در د   بہ ز خراسانست ہوا، در ہمہ سو

پہلی حجت یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کی سردی نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔

اولش آں شد کہ در و آدمیاں   از دمۂ سرد نہ بیند زیاں

دوسری حجت ہے کہ ہندوستان کی گرمی، خراسان کی سردی سے بہتر ہے خراسان کی سردی جان لیوا ہوتی ہے۔ سردی کی شدت سے لوگ اکڑ جاتے ہیں۔ اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں

دویم ست آں کاہل خراساں گر   ہر کہ بیاں سوخت ز سرما تندہ کر
خندہ ایں گفت و بر ایں اوجاں   طعنہ گرانش زند شعلہ زناں
آنکہ بر گرماست ہمار حجت و بس   لیک سود کشتہ ز سرما ہمہ کس

تیسری حجت یہ ہے کہ ہندوستان کی سردی بے ضرر ہے وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ یہاں کی سردی اور سرد ہوا فرحت بخش ہے۔

سیومش آں کیں طرف از نیم ہوا   کم طلبد مفلس کم مایہ نوا
بر لب جوز آب خنک رہنماں   غسل کند آخر شب عوطہ زناں
خود گرما شود شاں غم حز   سایۂ شاخے بس و از کلبہ دگر

چوتھی، پانچویں اور چھٹی حجت میں ہندوستان کے سدا بہار پھولوں کی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں سال بھر گل و ریحان کی بہار رہتی ہے یہاں کے پھول، گل بابونہ کی طرح خوش رنگ و دلکش ہوتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خشک ہو جانے پر بھی، خوشبودار رہتے ہیں۔

چارم شاں کیں طرف از سبزہ گل   ہست ہمہ سال بہار گل دل

پنجم از ایں گلشاں رُوی بروی   رنگ خوش چوں گل بابونہ دروی

حجت ششم این کہ اگر ہست دراں   خشک شود، بو نزند زرد بحال
ایں گل بابونہ اگر خشک شود   طلہ دروں تا در از مشک شود

ساتویں اور آٹھویں حجت میں ہندوستان کے تر و تازہ میوے اور پھل کا ذکر ہے یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان میں خراسان کے سب میوے پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ خراسان میں ہندوستان کا ایک میوہ بھی نہیں ہوتا۔

ہفتمش آں کاں طرف از میوہ تر   ہست چو امرود چو انگور دگر
میوہ دگر کم نگری کر خلش   لا چی و کافور و تر نعل بدلش

ہشتمش آں شد کہ لیے میوہ شاں   ہست بہ ہند دسوئی شاں زیں نشاں

ہندوستان میں دو نادر تحفے ہوتے ہیں ایک کیلا دوسرا پان، نویں اور دسویں حجت میں خسرو نے کیلے اور پان کو ہندوستان کا بے مثل تحفہ بتایا ہے۔

ہست نہم آنکہ دریں کشور خوش   ہست دو تحفہ کہ بود نادرہ وش
میوۂ لے خستہ کہ نہ بود در جہاں   برگ کہ چوں میوہ خورند مہماں
موز ہماں میوۂ بے خستہ نگر   برگ ز تنبول نگر نائب خور
ہست دہم آنکہ چوں تنبول گزیں   میوہ نہ مانند بہ ہمہ روئے زمیں[2]

خسرو نے پان کی تعریف اپنی ایک اور مثنوی قران السعدین میں بھی کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ ہندوستان کی بہترین نعمت ہے۔ کہنے کو تو گھاس ہے۔ لیکن انتہائی مفید، اس کے کھانے والا جذام اور برص سے محفوظ رہتا ہے۔ اس سے خون صاف پیدا ہوتا ہے۔ یہ منھ کی بدبو کو دور کرتا ہے اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے کھانے سے بھوک زیادہ ہو تو کم بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے کھانے سے بھوک بڑھتی بھی ہے اس کو چھوٹے بڑے امیر غریب، شاہ و گدا سب پسند کرتے ہیں۔

نادرہ برگے چو گل بوستاں   خوب تریں نعمت ہندوستاں
تیز چو گوش فرس تیز خیز   صورت و معنی بصفت ہر دو تیز

---

[1] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۰، [2] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۵۰ تا ۱۶۱

تیزی او آلت قطع جذام — ور نبی رفتہ علیہ السلام[1]
طرفہ نباتے کہ شد اندر دہن — گوش چو حیوان بدر آید ز تن
گر بدن آن بوتہ دہن گم کند — ہستی دنداں ہمہ محکم کند
سیر بود گرسنہ در دم شود — گرسنہ را گرسنگی کم شود
حرمتش از پیشگہ پادشاہ — ہم نگر احرام وہم پناہ[2]

دول رانی خضر خاں میں بھی پھول کے متعلق لکھتے ہیں۔

خراساں کہ ہندی گردش گل — چنانچہ باشد نیز و شش برگ تنبول
شناسد آنکہ مرد زندگانی است — کہ دو برگ جانی در جانی است[3]

مختلف مقامات کے پھول، پھل اور میوہ جات کا ذکر خسرو نے قریب قریب تمام مثنویوں میں کیا ہے۔ وہ اپنے وطن کی ایک ایک بات کو بڑے کیف و نشاط کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور وطن کی حکایت انہیں اتنی لذیذ ہے کہ بار بار بیان کرنے پر بھی ان کا جی نہیں بھرتا۔

ہندوستان زبانوں کا جزیرہ رہا ہے، اس وسیع و عریض ملک کے ہر خطے کی زبان اور بولی الگ الگ ہے۔ خسرو نے ہندوستان کی عظمت کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ اس ملک میں جس کثرت سے مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ دنیا کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتیں۔ انھوں نے یہاں کی زبانوں کی کثرت اور خوبیاں بتاتی ہیں۔ خاص طور پر ہندوی، پارسی، عربی، سندھی، لاہوری، کشمیری، کبر، دھور سمندری، تلنگی، گجر، معبری، گوری، بنگالی، اودھ اور سنسکرت کا تذکرہ کیا ہے۔ سنسکرت کو وہ برہمنوں میں سے بھی صرف چند کی زبان بتاتے ہیں لیکن اس کی وسعت اور برتری کے قائل ہیں اس کو عربی سے تو نہیں پارسی سے بہتر سمجھتے ہیں۔

آنست زبانے بہ صفت دُر دری
از عربی کمتر و برتر ز دری

تمام زبانوں کا ذکر تاریخی اعتبار سے اس طرح کیا ہے۔

ہند نہیں قاعدہ دارند سخن — ہندوی بود است در ایام کہن
غوری و ترک آمد و تا امرایاں — پارسی بود بہ ہمدار جہاں
الغرض از پارسی و ترک درت — سیدہ باشد کہ کم دل رطرب
من چو ز ہندم بود آب کہ کسے — از محل خویش برآرد نفسے
سندی و لاہوری و کشمیری و کبر — دھور سمندری، تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اود — دہلی و پیرامش اندر ہمہ حد
این ہمہ ہندویست کہ ز ایام کہن — عامہ بکار است بہر گونہ سخن
لیک زبانیست دگر کز سخنان — آنست گزیں نزد ہمہ برہمنان
سنسکرت نام ز عہد کہنش — عامہ ندارد خبر از کن مکنش

بر جہش دانہ و ہر بر جہنہ — نیز نماند حذر از آن سہ گنہ

مثنوی دول رانی خضر خاں میں ہر زبان ہند کو دیباچہ اشعار میں بیان کیا ہے

غلط کردم گر از دانش زنی دم — نہ لفظ ہندویست از پارسی کم
بجز تازی کہ میر ہر زبان است — کہ بر گل زبان ہا کامران است
زبان ہند ہم تازی مثالی است — کہ آمیزش در آنجا کم مجالی است

دگر پرسی بیانش از معانی — در آن سر زار دگر ہا کم مدانی
اگر از صدق و انصاف دہم شرح — خرد ہندی کسی کعبار من شرح
کسے کز گنگ ہندوستان بود دور — ز نیل و دجلہ لاف است معذور
چو در جنس دیدہ بلبل بوستان را — چہ داند طوطی ہندوستان را[4]

جس ملک میں بکثرت زبانیں بولی جاتی ہوں، وہاں کے باشندوں کو یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف و متضاد زبانوں کو آسانی کے ساتھ بول سکیں، ہندوستانیوں میں بھی یہ خصوصیت اور صفت پائی جاتی ہے کہ وہ ہر زبان (ملکی یا غیر ملکی) آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ اس کو صحیح صحیح بول سکتے ہیں۔ ان کا تلفظ اور لہجہ درست ہوتا ہے۔

امیر خسرو نے اس صفت میں بھی ہندوستان اور ہندوستانیوں کو تمام دنیا سے بہتر اور افضل بتایا ہے۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ یہاں کے جانوروں کو بھی دوسرے ملکوں کے جانوروں سے چند خصوصیات کی بنا پر برتر بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے طوطا، مینا، سارس، کوا، گوریا، مور، بگلا، مرغ، سقا (پانی بھرنے والا پرندہ)، گھوڑا، بکری، بندر اور ہاتھی، وغیرہ کی خوبیاں اور خصوصیات لکھی ہیں انھوں نے ایک ایسے جانور کا بھی ذکر کیا ہے جو ہرن کی شکل کا ہوتا ہے اور گدھے کی طرح بولتا ہے۔

طوطے کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

میں تحش بر صفت آدمیاں — ہر چہ شنیدہ است بگوید بیاں
فاتحہ و اخلاص و دعا در دہنش — نام ولی و محمد و تو سخنش

اسی طرح انھوں نے ہر جانور کی خصوصیت لکھی ہے۔

خسرو کا مسلک صلح کل رہا ہے، وہ انسانیت اور انسانی عظمت کے قائل ہیں وہ خدا کے ہر بندہ سے محبت کرتے ہیں۔ ان کا دل نفرت و تعصب سے پاک ہے محبت اور خلوص سے لبریز ہے۔ ان کے یہاں مذہب کا جھگڑا نہیں ہے۔ وہ اپنے وطن ہندوستان کو اس لحاظ سے بھی عظیم اور برتر بتاتے ہیں کہ یہاں کے مردوں، عورتوں اور بچوں میں اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں۔ وہ بڑے وفادار، خلیق، شجاع، خوبصورت اور مہمان نواز ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اہل ہنود کا ثنویہ، پارسی، عیسائی، مجسمہ، ستارہ پرست جیسے فرقوں سے موازنہ کیا ہے اور ان سب سے ان کو بہتر ثابت کیا ہے۔

معترف وحدت و ہستی و قدم — قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم

---

[1] حدیث نبوی میں ہے کہ ہندوستان میں ایک درخت ہے جس کے پتے گھوڑے کے کان کی طرح ہوتے ہیں اور اس کے کھانے والے جذام و برص سے محفوظ رہتے ہیں۔ [2] قران السعدین صفحہ ۱۸۵-۱۸۶۔ [3] دول رانی خضر خاں صفحہ ۴۴ [4] نہ سپہر صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۱) [5] دول رانی خضر خاں صفحہ ۴۱-۴۲۔

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

تالیفاتِ خسرو کا ایک جائزہ

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ فارسی شاعری کا انداز چودھویں صدی عیسوی میں ہندستان کی سرزمین میں وہی رہا جو اس وقت ایران میں تھا۔ شیخ سعدی شیرازی کی ادبی شخصیت ایران پر جس طرح حاوی رہی اسی طرح امیر خسرو دہلوی کا سکہ ہندوستان میں جاری رہا۔ خسرو کا زمانہ شباب سعدی کے عالم شیب سے ملا ہوا تھا۔ دونوں شخصیتیں فطرت کے شعر پرور رحجانات کا شاہکار ہیں۔ جو ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں بلکہ مدتوں کے بعد ایک تہذیب، ایک تمدن اور ایک ثقافت کی یادگار بن کر سامنے آتی ہیں۔ دونوں کی شاعری میں آشوب وقت کا ردِ عمل تھا دونوں کے کلام میں تصوف کی چاشنی تھی۔ اور دونوں کے شعر جذبات کی تصویر کشی کا مرقع تھے اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا نے خسرو کے کلام کو بے ساختگی اور بانکپن بخشا اور واقعیت اور مترنم انداز کا مجموعہ بنا دیا۔

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعدی کو شہزادہ محمد ملتان نے دو مرتبہ دعوت دی لیکن سعدی نے بڑھاپے کا عذر پیش کیا اور ہندوستان تشریف نہیں لائے۔ تاہم انھوں نے اس خط میں اپنا خراج عقیدت اس طرح پیش کیا: "در ہند خسرو بس است" اسی طرح حافظ شیرازی خسرو کی شیریں کلامی کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اور مولانا جامی اپنی تصنیف بہارستان میں خسرو کی مثنویوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے بھی نہیں لکھا"

تین سو سال کے بعد بھی عرفی شیرازی جیسے اکبری دربار کے قادر الکلام شاعر بھی خسرو کی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ؎

بروح خسرو از ایں پارسی شکر دارم

کہ کام طوطیٔ ہندوستاں شود شیریں

امیر الشعراء ابوالحسن یمین الدین خسرو معروف بہ امیر خسرو ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جب خسرو پیدا ہوئے تو ان کے والد ماجد امیر سیف الدین محمود بچہ کو خرقہ میں لپیٹ کر ایک صوفی مست بزرگ کے پاس لے گئے جنھوں نے بچہ کو دیکھتے ہی فرمایا: "قیامت تک اس کا نام زندہ رہے گا اور خاقانی شروانی سے دو قدم آگے بڑھ جائے گا۔"

خسرو زمانۂ طفولیت سے ہی شعر موزوں کر لیتے تھے۔ اور بقول خسرو جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد بزرگوار نے انھیں مکتب میں بٹھایا اور خوش نویسی کی مشق کے لئے خطاط زمانہ قاضی اسد الدین کے سپرد کیا۔ خسرو کی طبیعت کی روانی اور ان کی شاعری کا ملکہ دیکھ کر انھیں ان کے استاد خواجہ عز الدین کے پاس لے گئے۔ اور کہا کہ یہ میرا شاگرد ہے لیکن خطاطی سے زیادہ شاعری کا ذوق رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب نے پہلے خسرو سے پڑھنے کے لئے کہا خسرو نے چند شعر خوش الحانی سے پڑھے۔ خواجہ صاحب بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ مو، بیضہ، تیر اور خربزہ ان چار بے جوڑ چیزوں کو موزوں کرو۔ خسرو نے برجستہ عرض کیا ؎

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است	صد بیضۂ عنبریں بر آں موئے ضم است
چوں تیر مداں راست دلش را زیرا	چوں خربزہ دنداںش میاں شکم است

خسرو کی یہ رباعی سن کر خواجہ صاحب بہت متحیر ہوئے۔ تعریف کی اور گلے سے لگا لیا "تمہارا تخلص سلطانی ہونا چاہیئے یہ تخلص تمہارے لئے فال نیک ہوگا"۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائی کلام میں خسرو اسی تخلص کے نام سے نظر آتے ہیں۔

خسرو نے کبھی بھی استادوں کی استادی سے انکار نہیں کیا بلکہ وہ تمام اساتذۂ فن کا احترام کرتے تھے۔ البتہ اپنے کلام کے بارے میں یہ تو کہتے ہیں کہ میں سرقہ نہیں کرتا اور نہ ہی میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر ہے تاہم ان کی غزلیں سوز و گداز اور والہانہ محبت کا پیکر ہیں۔ اور ان کی مثنویاں مطرب نگاری اور منظر کشی کا مظہر ہیں ان کے قصیدے معنی آفرینی اور باریک خیالی کا مرقع ہیں اور ان کے مرثیے درد و الم اور رنج و اندوہ کا مخزن ہیں۔ خسرو اس بات کا اعتراف کرنے سے دریغ نہیں کرتے کہ غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی، قصیدے میں خاقانی اور اخلاقیات میں سنائی جیسے شعرائے قدیم کے مقلد و پیرو ہیں۔

خسرو نے اپنی بہتر سالہ زندگی میں ہندوستان کے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے۔ اور انھیں اپنے معاصرین میں ایک خاص حیثیت اور مرتبہ حاصل تھا۔ ایک طرف خسرو دربار شاہی

سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جانب حضرت نظام الدین اولیاء کے معتقد تھے۔ امارت اور ولایت کے غیر معمولی امتیازات کے باوجود خسرو کے کلام کی مسلّم خوبیوں نے ان کے کلام کے بیشتر قابلِ قدر حصے کو زمانہ کے دستبرد سے بچا لیا۔ خسرو نے بیشتر کلام کے بیشتر حصے کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا اور اپنی تالیفات کے دیباچوں میں اشعار کی تعداد، سن تصنیف اور موضوع تدوین و ترتیب جیسی بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ نظم میں پانچ دیوان، مثنویاں اور غزلیات کے متفرق مجموعے موجود ہیں نثر میں اعجازِ خسروی، خزائن الفتوح اور افضل الفوائد قابلِ قدر تصانیف ہیں۔

تحفۃ الصغر خسرو کا پہلا دیوان ہے جو انھوں نے ۶۷۱ھ میں مرتب کیا۔ اس میں تقریباً ان کے جوانی کا کلام شامل ہے۔ جو انھوں نے سولہ۱۶ سال سے انیس۱۹ سال کی عمر تک لکھا ہے۔ ابتدا میں خسرو نے خاقانی، انوری اور سنائی جیسے مسلم الثبوت اساتذۂ فارسی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی، گو انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ دیباچہ میں خسرو نے اپنی زندگی کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ ہر ایک قصیدہ کے شروع میں ایک شعر ہوتا ہے جو قصیدہ کے مفہوم کو واضح کرتا ہے ان تمام شعروں کو یکجا کرنے سے ایک قصیدہ ہو جاتا ہے یہ خسرو کی ایجاد ہے۔ قصائد زیادہ تر سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کے بیٹے شہزادہ نصرت الدین محمد کی مدح میں ہیں۔ ایک ترکیب بند میں خسرو نے اپنے نانا عماد الملک کا مرثیہ لکھا ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن کے مقربین میں تھے۔ اس دیوان میں خسرو اپنا تخلص سلطانی کرتے ہیں۔

وسط الحیات کو خسرو نے ۶۸۴ھ میں ترتیب دیا۔ اس میں بیس۲۰ سے چوبیس۲۴ اور تیس۳۰ سے تینتیس۳۳ سال کی عمر کا کلام ملتا ہے اس میں خسرو نے اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے اور دیگر تین دیوان مرتب کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زیادہ تر قصیدے سلطان نصرت الدین محمد کی مدح میں ہیں۔ اور ایک ان کا مرثیہ ہے تاریخی اعتبار اور فنی لحاظ سے اس دیوان کے قصیدے زیادہ دلچسپ ہیں۔ ان قصیدوں میں انھوں نے کبھی خاقانی شیروانی کی پیروی کی ہے تو کبھی کمال اصفہانی کے اندازِ کلام کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

غرۃ الکمال خسرو کا تیسرا دیوان ہے جو انھوں نے ۶۹۳ھ میں تمام کیا اس میں چونتیس۳۴ سے پینتالیس سال کی عمر تک کا کلام شامل ہے اس کے مقدمہ میں خسرو نے ہندوستان کی فارسی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ اور عربی شاعری پر اس کی فوقیت کو واضح کیا ہے یہ سب سے بڑا دیوان ہے۔ اس میں قدیم شعرائے ایران کی پیروی کی ہے خسرو کے مشہور قصیدے، جنات الجنات، مرآۃ الصفا اور دریائے ابرار اسی دیوان میں پائے جاتے ہیں قصیدوں کے علاوہ اس میں ترجیع بند اور قطعے بھی ہیں۔

بقیہ نقیہ خسرو کا چوتھا دیوان ہے اس کو ۷۱۶ھ میں ترتیب دیا ہے اس میں زیادہ تر بڑھاپے کا کلام ہے اور قصیدے بھی قدیم اساتذۂ ایران کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ سلطان علاء الدین خلجی کا بھی ہے۔

نہایۃ الکمال کو خسرو نے سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال اور سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی اور ان کے انتقال سے کچھ پہلے تالیف کیا ہے۔ یہ دیوان نادر ہے اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدح میں چند قصائد میں تصوف اور حقائق و معارف کے مسائل بیان کئے ہیں۔ یہ پانچواں دیوان خسرو کے آخری دنوں کا ہے۔

نہ سپہر کو خسرو نے ۷۱۸ھ میں مکمل کیا۔ یہ مثنوی نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ معاشرتی اعتبار سے بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اس میں نو باب ہیں۔ اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام نہ سپہر رکھا گیا مختلف بحروں کا ایک ہی مثنوی میں استعمال کرنے کا طریقہ خسرو کی جدت ہے۔ ایک باب ہندوستان سے متعلق ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کیا ہے فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں علم و فن نے تمام ملکوں سے زیادہ وسعت حاصل کر لی ہے ہندوستان میں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے ہیں ہندوستان کے لوگ دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان نے اور ملکوں کے مقابلے میں فن موسیقی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے ہندوستان کی ایجادوں میں "شطرنج" اور "صفر" بھی ہیں۔ ہندوستان میں دو حسن قابل قدر بالطبع ملتی ہے۔ جو تہذیب سیاست سنگیت اور معاشرت کا مرقع ہے۔ ہندوستان کی تخلیقات میں پنچ تنتر بھی ہے جس کا ترجمہ عربی، فارسی، ترکی کے علاوہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہوا ہے۔ اور ہندوستان ہی میں خسرو جیسے سحر البیان اور جادو قلم پیدا ہوئے ہیں سلطان قطب الدین مبارک نے اس مثنوی کی تکمیل پر ہاتھی برابر تول کر روپے دیئے۔ خسرو لکھتے ہیں ؎

چو میراث شہ پیل زر دادنم — نہ زیباست رب پیل زر دادنم
شہا ہیچ بختا کرم گسترا — معانی شناسا سخن پرورا
چنیں بخشش کز توجہم یافتم — در ایام پیشینہ کم یافتم

سلطان غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات کا تفصیلی ذکر ایک تاریخی مثنوی تغلق نامہ میں کیا ہے۔ یہ تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہے جس کو خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے مرتب کیا یہ مثنوی تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے اس میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی بھی تاریخ میں درج نہیں ہیں۔ دراصل تغلق نامہ عہد تغلق کی مفصل تاریخ ہے۔

پنج گنج نظامی گنجوی کے خمسۂ نظامی کا جواب انھوں نے خمسۂ خسرو کے نام سے ۶۹۸ھ اور ۷۰۱ھ کے درمیانی عرصہ میں تکمیل کیا۔ بقول خسرو ان مثنویوں کی تالیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے جو خسرو کی نادر الکلامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز معجزہ ہے مولانا جامی بجا فرماتے ہیں کہ "خمسۂ نظامی را از وی کسی در جواب نگفتہ"۔

خمسۂ خسروی کے سلسلہ کی پہلی مثنوی "مطلع الانوار" ہے جو نظامی کے "مخزن الاسرار" کا جواب ہے اس مثنوی کو خسرو نے ۶۹۸ھ میں ترتیب دیا اور یہ مثنوی دینی اور اصلاحی نکات پر مشتمل ہے اس مثنوی کو صرف دو ہفتے میں لکھا ہے۔ دوسری مثنوی شیریں و خسرو ہے جو نظامی کی خسرو شیریں کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا سن تالیف ۶۹۸ھ ہے اور اس میں خسرو نے ہر قسم کی شاعری کے مواقع پیدا کئے اور کمال دکھلایا ہے تاہم نظامی گنجوی کے سامنے خاکساری سے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے ؎

نی داد چو نظم نامہ رائج
باقی نگذاشت بہر ما ہیچ

• "مجنوں ولیلیٰ" کو خسرو نے ۶۹۹ھ میں نظامی کی لیلیٰ مجنوں کے نمونہ پر تالیف کیا اس مثنوی کا سب سے پُر اثر حصہ وہ شعر ہیں جن میں خسرو نے اپنے بھائی اور ماں کی وفات کا ماتم کیا ہے

امسال دو نور ز اختر م رفت
ہم مادرم و ہم برادرم رفت

چوتھی مثنوی "آئینہ سکندری" کو خسرو نے نظامی کے سکندر نامہ کے جواب میں لکھا ہے اس مثنوی کو بھی ۶۹۹ھ میں مکمل کر لیا ہے۔ اس میں خسرو نظامی کے دوش بدوش ہیں اس سلسلہ کی آخری مثنوی "ہشت بہشت" ہے۔ جو نظامی کے "ہفت پیکر" کے طرز پر لکھی گئی ہے اس کا سنہ تالیف ۷۰۱ھ ہے اور اس میں بہرام کی حکایت کو بیان کیا گیا ہے اس مثنوی میں خسرو کی شاعری پختگی اور پرکاری کی آخری حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے خاتمے میں ایک بات کی صراحت کی ہے کہ خمسہ تین سال کی مدت میں لکھا گیا ہے اور اس زمانے کے ایک عالم و فاضل قاضی شہاب الدین نے ان پانچوں مثنویوں کا مطالعہ کر کے تصحیح کی ہے

ے یارب او چوں زیج نامۂ من   رد برون خطائی خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد   رقیامت خط اماں ش باد

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ شہاب نے پانچوں مثنویوں کو اصلاح دی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو بڑے منکسر تھے۔ جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں استاد کی رائے کو تسلیم نہیں کرتے تھے اگر ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

ع   عیب آں بر من است۔ بروی

خسرو کی طبیعت کی جولانی اور فکر رسا نے جہاں اقسام شاعری میں وہ جوہر دکھائے ہیں جن کا مقابلہ آج تک کوئی نہ کر سکا، وہاں نثر نگاری میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہے "اعجاز خسروی" وہ نثری کارنامہ ہے جس میں خسرو نے زبان و بیان کے اصول منضبط کئے ہیں اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں یہ تین جلدوں میں ہے اور اس کو انھوں نے ۷۱۹ھ میں تالیف کیا "خزائن الفتوح" جو تاریخ علائی کے نام سے بھی موسوم ہے خسرو نے ۷۱۱ھ میں مکمل کی اس میں سلطان علاء الدین کی فتوحات اور اس زمانے کے پس منظر اور حالات کو نفیس پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بڑی اہم تصنیف ہے۔ سلطان علاء الدین نے اس تاریخی تالیف پر خسرو کے لئے ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ ایک اور نثری کارنامہ "افضل الفوائد" کے نام سے مشہور ہے جس میں خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات شامل کئے ہیں۔ اس کے ایک حصہ کو خسرو نے ۷۱۹ھ میں اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے پسند کیا۔

خسرو نے جس قدر فارسی میں لکھا ہے اسی قدر بھاشا (ہندی) میں بھی ہے۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں خسرو لکھتے ہیں "جزوی از نظم ہندی نیز در دوستان کردہ ام" خسرو ترکی بھی جانتے تھے اور عربی میں ادبائے عرب کے ہم پلہ تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا سنسکرت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ مہ سپہر میں اپنی سنسکرت دانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ع من قدرے رسراں کا رشدم؛ بہرکیف سیر الاولیاء کے مؤلف امیر خورد کے مطابق خسرو نے ننانوے ۹۹ کتابیں تالیف کی ہیں نفحات الانس کے مصنف ملا جامی کی رائے میں خسرو ننانوے ۹۹ کتابوں کے مؤلف ہیں۔

خسرو کی تالیفات کا مطالعہ ہندوستان کی تیرھویں صدی عیسوی کی وہ تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملی جلی تہذیب و تمدن کے نقوش نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خسرو کی تصانیف نہ صرف اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہیں بلکہ اس کے زمانے کے ہندوستان کے مزاج و ذہنیت کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ خسرو کی ذات ہندوستان کے لئے قران السعدین تھی جس میں دو تہذیبوں، دو معاشرتوں اور دو تقاضوں کا سنگم نظر آتا ہے مختصراً خسرو اپنے عہد کے اساتذۂ ایران کے معاصر ہونے کے باوجود ہند و ایران کے مابین ثقافتی سفیر کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی تالیفات ایک طرف قوم و ملک کو اپنے شاندار ماضی کی یاد دلانے کا ذریعہ ہیں تو دوسری جانب ان کی تخلیقات ہند و ایران کے تعلقات کو مستحکم کرنے کا ایک شاہ کار ہیں۔

گوری سووے سیج پہ مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت امیر خسرو کو ترک اللہ کا لقب دیا تھا فرماتے ہیں۔

"روز حشر امید وارم کہ این سوز سینۂ این ترک بہ بخشند"

اور ان اشعار کو بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

خسرو کہ بہ شاعری نظیرش کم خاست
در ملک سخن وری تہی خسرو است
این خسرو ماست، ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

امیر حسن عابدی

امیر خسرو بحیثیت فارسی غزل گو

حضرت امیر خسرو دہلوی جیسی جامع اور گوناگوں شخصیت فارسی ادب میں شاید ہی کوئی دوسری نظر آتی ہو۔ آپ ایک زبردست شاعر، ایک بلند مرتبہ نثر نگار، ایک عظیم الشان صوفی، ایک قابل قدر درباری، ایک اچھے دوست، ایک وسیع المشرب اور رند انسان، ایک بڑے موسیقی داں، ایک وطن پرست ہندوستانی، ایک بڑے معمار سبک ہندی کے بنیاد گزار، ہندی کے شاعر، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ اور علمبردار، صاحب رزم و بزم اور مالک سیف و قلم رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے"۔[۲]

اس تنوع اور ہمہ گیری کے باوجود آپ کا خاص میدان فارسی شاعری ہے اور آپ ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی کے شاعر مانے گئے ہیں۔ آپ کے اشعار کی تعداد لاکھوں تک بتائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں "امیر خسرو فارسی کے پرکارترین شعرا میں سے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ خود امیر خسرو کے قول کے مطابق ان کے اشعار چار لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے کم ہیں۔ شاہرخ کے بیٹے مرزا بایسنقر نے ان میں سے ایک لاکھ بائیس ہزار اشعار کو جمع کیا تھا۔ بے کسی تردید کے خسرو دہلوی ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی کے شاعر اور فارسی کے شیریں سخن اور پرگو ترین شعرا میں سے ہیں۔ امیر خسرو اسی طبع رواں، خدا داد ذوق اور ذہن کی تیزی کی مدد سے، نیز اس وجہ سے کہ انہوں نے فارسی ادب کے بہت اچھے ماحول میں تربیت پائی تھی اور ایک نیا لہجہ، تازہ ترکیبیں اور خاص قسم کے افکار ان کے حصہ میں آتے تھے، ملتان کے اشعار میں بہت سی نادرگیاں پائی جاتی ہیں اور بہت سے نئے مضامین اور منتخب اشعار ان کے آثار میں دکھائی دیتے ہیں اور مسلماً یہی وجہ ہے کہ بعد کے آنے والے شعرا اور لکھنے والوں نے ان کو استادانہ طور پر یاد کیا ہے مثلاً جامی ان کو داستان سرائی میں نظامی کے بعد رکھتے ہیں۔ نیز نظامی کے کلام کو "گوہر" اور خسرو کے کلام کو "زر دہی" سے تشبیہ دی ہے"۔[۳] شبلی کہتے ہیں "فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطے یا تے سخن یعنی مستزاد، اور صنائع بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں"۔[۴]

امیر خسرو نے مثنویوں میں نظامی کی پیروی کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر چہ اس درجہ تک نہ پہنچ سکے، مگر اس صنف سخن میں نظامی کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو آپ کا ہے۔ اس کے علاوہ کثرت سے قصیدے، قطعے اور رباعیاں کہی ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں "مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں، غزل میں سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے قصائد لے کر دیکھو، کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں"۔[۵] اس میں شک نہیں کہ علامہ شبلی نے امیر خسرو کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے، مگر اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ ان جلیل القدر شعرا کے بعد ان صنفوں میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

---

[۱] ۶۵۱ ـ ۷۲۵ ہجری / ۱۲۵۳ ـ ۱۳۲۵ عیسوی [۲] شعر العجم، جلد دوم، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۸

[۳] تاریخ ادبیات در ایران، جلد سوم، بخش دوم، دانش گاہ تہران، ۱۳۵۲ ہجری شمسی، ص ۵۵۴ ـ ۵۵۶

[۴] شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۱۸ ـ ۱۱۹ [۵] شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۱۸ ـ ۱۱۹

امیر خسرو کے اشعار اور کلام کا مطالعہ صرف شعری خوبیوں کے لئے نہیں بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان سے ہمیں ہندوستان کی اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے، نیز اس عہد کی ایک اچھی خاصی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مرحوم ڈاکٹر تارا چند صاحب نے ان کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرہویں اور چودھویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی طرز حیات اور تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور ادیب اس زمانہ میں کیسے جذبے، کیسے خیال رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں سے جن میں اسلامی ملک شامل تھے، ترجیح دیتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی روایت کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ خسرو کی ذات قران السعدین تھی جس میں دونوں تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ خسرو صوفی منش درویش انسان تھے، ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت تھی۔ شاعری بھی ان صفتوں کی حامل ہے۔ ان کے کلام میں تیرہویں چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا سچا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاست کی روشن تصویریں ہیں، اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں، راہ عشق کے پیچ و خم محبت کے مستانوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں، آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے اور ناکامیوں کا الم، پند و نصیحت، حکمت و تدبیر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے جو خسرو سخن کے قلمرو سے باہر ہے۔ خسرو کا کلام ہندوستان کی محبت سے لبریز ہے۔ چھ سو سال گذرنے پر بھی خسرو کا کلام ہمارے لئے وہ مشعل ہدایت ہے جو منزل مقصود کی طرف ہماری راہبری کرتا ہے۔"[1]

فارسی شاعری کی سب سے بڑی صنف غزل ہے جو عشق و عاشقی کے مضامین کے لئے مخصوص ہے۔ شبلی لکھتے ہیں "عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اور چونکہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتی لیکن ایران اس خصوصیت میں اور تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے"[2]۔ یوں تو حضرت امیر خسرو نے تمام اصناف سخن میں قدرت کلام کا اظہار کیا ہے، مگر ان کا خاص میدان غزل ہے جو فارسی اور اردو شاعری کی جان ہے۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں "امیر خسرو کی غزلیں معمولی غزل کی حد سے باہر نہیں نکل سکی ہیں اور ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہیں۔ ان میں آرزوئے دیدار، ہجران یار، نرگس بیمار، سوزش شمع، یار کرشمہ ساز، زلف کمند انداز، سیل اشک، خدنگ نرگس مست، کمان جیسے ابرو اور کشک خون تمام سے بحث کی گئی ہے اور زرقہ پوشوں کے زہد کا، دروغوں کے زہد سے مقابلہ کیا گیا ہے، نیز چشم زیبا اور ان کے حالات اور شکلوں کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے"[3]۔ مگر میرا خیال ہے کہ انھوں نے امیر خسرو کی غزل گوئی کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا ہے اور ایک چلتا ہوا اوپری نظریہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں شبلی محمد خاں خورجوی فرماتے ہیں "آج خسرو کی تمام شہرت کا زیادہ تر دار و مدار ان کی غزلوں کی وجہ سے ہے اور اہل دل آج بھی اسی طرح سر دھنتے ہیں جیسے کہ ان کے زمانے میں"[4]۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے سب سے زیادہ امیر خسرو کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "خسرو کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے زمانے سے لے کر آج چھ سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں لیکن سماع اور قوالی کی محفلوں میں غالباً اب بھی سب سے زیادہ ان ہی کی غزلیں مقبول اور رائج ہیں اور اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ ان کا کوئی شعر سن کر بعض لوگوں پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوگئی کہ وہ جان سے گذر گئے"[5]۔

تصوف کو فارسی شاعری کی جان کہا گیا ہے، جس کے بغیر فارسی شاعری کا قالب بے روح ہے۔ معمولی عشق و محبت اور مجازی عشق بازیوں سے غزل میں وہ گہرائی کہاں پیدا ہو سکتی تھی جو روحانی اور حقیقی عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بڑے بڑے غزل گو شعرا کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی عظمت کا راز ان کی صوفیانہ اور روحانی شاعری اور عشق و محبت میں پوشیدہ ہے۔ غزل اگرچہ رودکی سے شروع ہوتی ہے مگر ابتدا میں اس میں وہ کشش نہیں جو بعد میں تصوف کی ملاوٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ "غزل کی ترقی تاریخ تصوف سے شروع ہوتی ہے۔ تصوف کی ابتدا اگرچہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوئی ہے، لیکن پانچویں صدی اس کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہی غزل کی ترقی کا دور ہے"[6]۔

حضرت امیر خسرو کی غزلوں کی حلاوت اور دلکشی کا راز بھی اسی میں ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری تصوف سے اور صوفیانہ شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار کی باریکیوں سے لبریز ہے، نیز اس میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں کا بہتر سے بہتر تناسب موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی غزلیں قوالوں کی زبان سے سنی جاتی ہیں اور محفل سماع کو آج بھی گرما رہی ہیں اور صاحبان دل و جگر کو آج بھی مجاز سے حقیقت تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں۔

بہر حال حضرت امیر خسرو نے شیخ سعدیؒ جیسے عظیم غزل گو کے بعد اور لسان الغیب حافظ شیرازیؒ جیسے بزرگ ترین غزل گو سے پہلے بطور سخن میں قدم رکھا تھا۔ شبلی، سعدی اور خسرو کا اس طرح ذکر کرتے ہیں "شیخ سعدی ایک مدت تک عشق و عاشقی میں بسر کر چکے تھے، اخیر اخیر تصوف کے حلقے میں آئے، وہ فطرتاً شاعر تھے، زبان خداداد تھی، ان باتوں نے مل کر ان کی غزل میں یہ اثر پیدا کر دیا کہ تمام ایران میں آگ لگ گئی۔ ان کے بعد خسرو اور حسن نے اس شراب کو اور تیز کر دیا"[7]۔ شبلی نے امیر خسرو کی غزلوں کی خصوصیات میں بحروں کی موزونی، سوز و گداز، جدت اسلوب، واقعہ گوئی اور معاملہ بندی، زور...

[1] امیر خسرو اور ہندوستان، امیر خسرو اکیڈمی، نئی دہلی، ص ۱۰، ۱۱، ۱۲۔ [2] شعر العجم، جلد پنجم ص ۳۲ [3] تاریخ ادبیات ایران (رضا زادہ شفق)، ص ۲۹ [4] حیات امیر خسرو (کتاب منزل کشمیری بازار لاہور) ص ۱۱۰ [5] امیر خسرو (ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۴۹ء) ص ۲۲۶-۲۲۷ [6] ایضاً ۳۲۹ ہجری-۹۴۱ عیسوی [7] شعر العجم جلد پنجم ص ۳۶ [8] ۶۹۱-۶۹۲ ہجری / ۱۲۹۱-۱۲۹۲ عیسوی [9] ۷۲۹ ۔ ۷۹۱ ہجری / ۱۳۲۶ ۔ ۱۳۸۹ عیسوی [10] شعر العجم، جلد پنجم، ص ۳۸۔

اور عام بول چال، جدت مضمون آفرینی کو شمار کیا ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں "غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، محبوب و نیاز۔ اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیا آمیز ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی کوئی الجھاؤ نہ ہو، غریب الفہم خیالات نہ ہوں۔ اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات و اختراعات کے چمن کھلا دیے۔"

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے سعدی اور امیر خسرو میر امیر خسرو اور حافظ کے شعروں کا مقابلہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔[1]

سعدی کہتے ہیں۔

فراق دوستانش باد یاران	که ما را دور کرد از دوستداران
لبکه در منظرم چیزی نیامد	صورت راست می دانم
شکست عهد مودت نگار دلبندم	برید عهد وفا یار سست پیوندم
کس نگه شب در دلم تا آن جا افتاد	یک لحظه از درون جای برون می رفتی

اور امیر خسرو کہتے ہیں۔

همی ریزی ساری خون یاران	همی باشد سزای دوستداران
ای وجود تو دیدهٔ جانم	جسم پیدا و جان پنهانم
چون من از دوست بداغ درد خرسندم	ز دوستی بود از دل نه مرهمی سندم
ای رخ از رنگ تو یافته دیده روشنی	چند به شوخی وجفا قصد هلاک من کنی

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں۔

عزم آن دارم که از دل نقد جان بیرون کنم
آرزوت در پیش وجود را از میان بیرون کنم

حال خود با ہر آنکس دگر نی سیم
بار کار دل خود زیر و زبر می بینم

اور حافظ شیرازی اپنے خاص انداز میں کہتے ہیں۔

دوش سودای رخت گفتم ز دل بیرون کنم
گفت کو زنجیر تا تدبیر این مجنون کنم

این چه شوریست که در دور قمر می بینم
همه آفاق پر از فتنه و شر می بینم

ویسے تو حضرت امیر خسرو نے پانچ دیوان تیار کئے تھے اور ان کا نام تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال رکھا تھا، پھر ان پر مقدمے لکھے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم دیوان غرۃ الکمال ہے۔ مگر بد قسمتی سے ابھی تک یہ دیوان ٹھیک سے چھپ سکے اور نہ اب تک کوئی منتخب دیوان ایڈٹ ہو کر منظر عام پر آ سکا۔ ایک بات یہ بھی کہہ دی جائے کہ اگرچہ خود امیر خسرو نے ان دیوانوں کو الگ الگ مرتب کیا تھا مگر لوگوں نے خاص کر کاتبوں نے اس ترتیب اور زمانی کا خیال نہیں رکھا اور عام طور سے دیوان امیر خسرو کے نام سے بکثرت قلمی نسخے ملتے ہیں جو در حقیقت تمام دیوانوں سے انتخاب ہوتے ہیں۔ یوں تو دیوان میں قصیدے، رباعیاں، قطعے اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہوتی ہیں مگر دیوان کی خاص چیز غزلیں ہوتی ہیں اور اکثر دیوان ایسے بھی ملتے ہیں جن میں سوائے غزل کے اور صنف سخن نہیں ہوتی۔

فارسی نثر و نظم میں تین سبک ہیں جن کو سبک خراسانی، سبک عراقی اور سبک ہندی سے یاد کیا گیا ہے۔ سبک ہندی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آورد ہوتی ہے، تصنع سے کام لیا جاتا ہے، دور از کار اور مصنوعی حالات و افکار کو جگہ دی جاتی ہے، تشبیہیں، استعارے وغیرہ بھی غیر طبعی ہوتے ہیں۔ حضرت امیر خسرو کو سبک ہندی کا بانی کہا گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نثر میں سبک ہندی کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہیں جس میں ثقل زبان و بیان بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے اور آورد ہی آورد ہے۔ بلکہ آپ نے بہت سی صنعتوں کا ایجاد کیا تھا اور نثر میں ان کو صرف بھی کیا گیا ہے مگر نظم خاص کر غزل میں یہ بات نہیں ہے۔ ان کی غزلیں انتہائی رواں دواں ہوتی ہیں، پھر ان میں آمد ہی آمد دکھائی پڑتی ہے اور غزل کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا ایران کے سب بڑے استادوں اور محققوں میں سے ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے فارسی ادب کی بڑی مفصل تاریخ لکھی ہے جس کی بہت سی جلدیں تہران یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں اور کچھ شائع ہونے والی ہیں۔ بہرحال یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کتاب کی تیسری جلد کا بخش دوم ابھی حال ہی میں منتشر ہوا ہے کہ اس میں ساتویں صدی ہجری کی ابتدا سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے آخر تک کے فارسی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، نیز اس جلد میں آپ نے حضرت امیر خسرو کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ستائیس صفحے ان کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ آپ نے امیر خسرو کے دیوانوں کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے پھر ان کے دیوان وسط الحیات، بقیہ نقیہ اور غرۃ الکمال سے چند غزلیں منتخب کر کے نقل کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا انتخاب خود اس قابل ہے کہ حضرت امیر خسرو کی بہترین تخلیقات میں شمار کیا جائے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ امیر خسرو کی غزلوں یا اشعار کا اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کر کے پیش کیا جائے بہتر ہوگا کہ انھیں کی منتخب کردہ غزلوں کو یہاں نقل کیا جائے۔ تاکہ اس سے حضرت کی عظمت اور سبک کا اندازہ ہو سکے، پھر ایرانی ذوق کا بھی پتہ چل سکے۔ اب یہاں تاریخ ادبیات در ایران سے حسب ذیل غزلیں نقل کی جا رہی ہیں جو ہم ہندوستانیوں کے لئے بھی سند کا کام کریں گی۔

---

[1] شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۵۲ [2] بزم مملوکیہ (مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء) ص ۳۱۶ - ۳۱۷

حسن الدین احمد

امیر خسرو کا عوامی لب و لہجہ

خسرو کا لب و لہجہ خود وہ اس بولی کے لحاظ سے ہو جو خسرو کے زمانہ میں دہلی اور اس کے آس پاس بولی جاتی تھی یا ان کے مزاج، طرز فکر اور رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے ہو، ان کا انداز یکسر عوامی تھا۔

جب قدرت کو انسانیت کے مفید مطلب اور تاریخ ساز کام لینا ہوتا ہے تو حکمراں اور محکوم طبقوں کے درمیان کے فاصلوں کو کم کرنے کے لئے خاص اہتمام ہوتے ہیں۔

امیر خسرو بھی حکمراں طبقہ کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے عوام سے قرب حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو مقام حاصل کیا اس کے معراج کو اچھی طرح محسوس کرنے کے لئے ہم کو پچھلی تاریخ میں ایک واضح مثال ملتی ہے اور وہ ہے حضرت موسیٰ کی۔

موسیٰ یہودی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو اس وقت محکوم تھی۔ ملک میں قہار و جبار فرعونوں کی حکومت تھی۔ موسیٰ اپنا تاریخی کام انجام نہ دے سکتے تھے اگر معجزاتی طریقہ پر ان کی پرورش خود فرعونوں کے محل میں نہ ہوتی۔ موسیٰ حکمراں طبقہ کے نمائندہ، اقتدار کے مالک اور اہرام کی تعمیر کے نگراں تھے۔ وہ نہ جان گئے تھے کہ وہ یہودی النسل ہیں۔ اور ان کی تعمیر میں حصہ لینے والے بیشتر مزدور ان کے ہم نسل ہیں۔ یہی خاص احساس تھا جو بالآخر مزدوروں کی کشمکش کے بنا کی تاریخ میں پہلی بار مزدوروں کے لئے اوقات کار کے تعین یعنی ہفتہ میں چھ دن کام کرنے کے قانون کو وجود میں لانے کا باعث ہوا۔

کچھ ایسی ہی بات امیر خسرو کے ساتھ رہی۔ خسرو اس نووارد حکمراں طبقہ کے نمائندہ تھے جس نے کچھ ہی عرصہ قبل اس ملک کو اپنا وطن بنایا تھا۔ لیکن اپنی والدہ کی طرف سے جو عماد الملک کی صاحبزادی تھیں وہ ہندی الاصل تھے۔ اس طرح ان کے لئے جذباتی سطح پر حکمراں اور محکوم طبقوں کے درمیانی فاصلہ کو عبور کرنا مشکل نہ تھا۔ اس صورت حال کو خود ان کی طبیعت کے انداز سے اور صوفی طریقے کے سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات سے کافی بڑھاوا ملا اور امیر خسرو نے اپنا عوامی لب و لہجہ اختیار کیا جو آج سات سو سال گزرنے کے بعد بھی اپنی آپ مثال ہے۔

جہاں تک بولی کا تعلق ہے امیر خسرو کی مادری زبان مغربی ہندی تھی جس پر ان کے زمانہ میں علاقائی زبانوں کے اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کی بارہ زبانیں گنوائی ہیں اور ان سب کو ہندوی کہا ہے۔ انھوں نے سندھی۔ لاہوری۔ کشمیری۔ ڈوگری۔ تامل۔ تلنگی۔ گجراتی گھاٹی۔ بہاری۔ بنگالی اودھی اور دہلوی زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح خود امیر خسرو کی مادری زبان کو ہم دہلوی ہندوی کہہ سکتے ہیں جو امیر خسرو کو اپنی والدہ اور نانا عماد الملک سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ بول چال کی زبان تھی جو بالائے آگرہ تک خفیف سی علاقائی تبدیلیوں کے ساتھ رائج تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں دلی کی زبان کھڑی بولی کی بیشتر رو آگرہ کی زبان برج کی بیشتر روپ تھی اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ اس دور میں دہلی اور آگرہ کی زبان کم و بیش ایک طرح کی رہی ہوگی۔ خسرو کا ہندوی کلام ان ہی دو زبانوں پر مشتمل ہے۔

امیر خسرو نے کھڑی بولی کے الفاظ اور فقرے فارسی کلام کے بیچ میں شامل کئے ہیں جیسے۔

رفتم بہ تماشائے کنار جوئے
دیدم بہ لب آب زنِ ہندوئے
گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود
فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے

آخری مصرعہ کی خوبی یہ ہے کہ بہ یک وقت فارسی کا بھی ہے اور کھڑی بولی کا بھی۔ فارسی کلام میں ہندوی اجزا کو پیوند کرنے کے متعلق سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ اس کا مقصد ظرافت کا سامان مہیا کرنا تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ امیر خسرو نے عوامی بولی کی قدر افزائی کرنے اور اس کی توجہ خاص کا مرکز بنانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور یہ تجربہ کامیاب ہوا جس کو دنیا کی ادبی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ کوشش شعوری تھی اور بامقصد۔

اسی طرح امیر خسرو نے خالص کھڑی بولی میں بھی خاصا کلام لکھا اور اپنے دوستوں میں تقسیم کیا۔ خسرو ہندوی میں شعر کہنے کو باعث ننگ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس پر انھیں فخر تھا۔ یہ کلام خود خسرو کی زندگی میں عوام میں مقبول تھا۔ افسوس کہ امتداد زمانہ کے باعث یہ کلام اب ناپید ہے اور جو چیدہ چیدہ کلام سینہ بہ سینہ ہم تک آیا ہے اس میں زبان کی تبدیلی کا بھی امکان ہے اور اس کا بڑا حصہ الحاقی بھی سمجھا جاتا ہے۔

خسرو کے دور کی عوامی بولی کے مقابل ایک طرف تو ملک کی زبان سنسکرت تھی جو ہندی عالموں، پنڈتوں اور اعلیٰ ذات والوں کی زبان تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں سنسکرت کے پنڈت بھی اس دیسی بولی کو حقارت سے دیکھتے تھے اور فارسی کے عالم بھی۔ خسرو نے ہندوی میں شاعری کی اور فارسی شاعری میں ہندوی الفاظ

کا استعمال کیا اور اس طرح اس زبان کے بولنے والوں میں جو احساس کمتری پیدا ہوا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس عوامی بولی کے دلدادہ تھے اور اس میں گیت دوہے پہیلیاں لکھ کر اس کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے اس زبان کے گیسوؤں کو سنوارا۔ اس کی شاعری میں فارسی کے اوزان استعمال کیتے۔ اور اس طرح اس زبان کے ارتقاء میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ آج اہل ہندی ہوں یا اہل اردو ہر دو امیر خسرو کو ہر دو زبانوں کا محسن اول مانتے ہیں۔

امیر خسرو کو درباری اور سپاہی کی حیثیت سے ملک میں سفر کرنے کے کافی مواقع ملے انھوں نے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں بولی جانے والی مختلف بولیوں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے ملک کے عوامی لٹریچر سے جو۔ وہ تحریری ہو یا زبانی بھرپور استفادہ کیا اس کے الفاظ۔ خیالات اور محاوروں کو اپنے کلام میں استعمال کیا۔

یہ تو اس بولی کی بات تھی جو ان کی مادری زبان تھی۔ لیکن جو شاعری انھوں نے فارسی میں کی ہے اور جس کے ذریعہ ایران کے اہل زبان سے بھی اپنا سکہ منوایا ہے اس کا لب ولہجہ بھی عوامی ہے۔ اپنی شاعری میں انھوں نے اپنے عہد کے عوام کی زندگی اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان کے تخلیقی کارنامے ان کے اپنے وطن کے عوام سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لئے بیشتر موضوعات عوامی زندگی سے لئے اور اپنی شاعری میں انسانی جذبات اور احساسات کو پیش کیا ہے انھوں نے عام آدمی کی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے کلام میں ہم کو مختلف پیشہ وروں اور اپنے اپنے فن کے ماہر کاریگروں کا ذکر ملتا ہے۔

خسرو کے عوامی لب ولہجہ پر سب سے زیادہ اثر صوفی طریقے کے چشتیہ سلسلہ کا پڑا۔

تصوف کا مزاج ہمیشہ سے جمہوری رہا۔ تصوف مخلوق خدا کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے اس تصور کا بنیادی خیال یہ ہے کہ خدا سے محبت کرنے والا اس کی مخلوق خصوصاً انسان سے بلا امتیاز مذہب و نسل محبت کرتا ہے۔ تصوف میں بھی دوسرے سلسلوں کے اور خصوصاً سہروردی سلسلہ کے مقابلہ میں چشتیہ سلسلہ اپنے رجحانات کے اعتبار سے جمہوری رہا اور جمہوری روایات چشتیہ سلسلہ میں برقرار رہیں۔ جس کا ثبوت ان کی تمام تعلیمات سے فراہم ہوتا ہے حضرت نظام الدین اولیا کا عوام پر کافی اثر تھا انھوں نے بھی کوئی سرکاری ملازمت یا جاگیر قبول نہیں کی۔ شیخ فرید نے اپنی خانقاہ میں کام کی تقسیم کر دی تھی۔ اور کھانا سب میں مساوی طور پر تقسیم ہوتا۔ چشتی بزرگوں کی تعلیمات کے موجب ذاتی محنت سے کمائی ہوئی آمدنی ہی جائز سمجھی جاتی تھی۔ چشتیہ سلسلہ کا خاص مشن تھا کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تال میل اور یکجہتی پیدا کریں اور ان کو ایک نیا راہ دکھائیں مسلمان حاکم مذہبی علماء کی احساس برتری اور ترک سرداروں کے غرور اور نسلی برتری کے جذبات سے بڑی حد تک محفوظ کریں یہی وجہ تھی کہ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات نے سادہ طبقہ کے لئے کشش اور جاذبیت رکھی تھیں۔ امیر خسرو نے تصوف کو اپنا لیا اور اس کے رنگ ورود سے اپنی فارسی شاعری کو آب و تاب دی۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ چشتیہ سلسلہ کی انسان دوستی کے خیالات کی ترویج کا ذریعہ تھا۔ خسرو نے اپنی عملی زندگی اور شاعری دونوں میں مخلوق خدا سے محبت کا ثبوت دیا۔ وہ ہر مذہب کے پیروؤں سے خلوص اور محبت کا اظہار کرتے۔ وہ مخلوق خدا سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انھوں نے حکمرانوں کو ہمیشہ انصاف سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ تم اقتدار حاصل کرنے کے خواہشمند ہو تو تمہیں عوام اور رعیت سے اچھا سلوک کرنا ہوگا۔ اس طرح خسرو نے تمام عمر اپنے عوامی لب ولہجہ کو برقرار رکھا۔ اور اپنے مرشد کے مزار پر ان کے جس آخری دوہے کے بول اکثر زبان پر آتے وہ بھی اس عوامی زبان کے تھے جس کو انھوں نے اپنا لیا تھا۔

بقیہ۔ امیر خسرو اور عصر جدید

عبارات کے بیان کی بات اور ہے کہ ایسے مواقع پر خسرو بھی اپنے ہم عصر مورخین کے محاورے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ان کا قلم کہیں در در یاں نہیں ہوتا ایک مورخ کے لئے امیر خسرو اطلاعات و معلومات کا بے پناہ ذخیرہ پیش کر سکتے ہیں منگولوں کے غولوں کا سراپا اور سلاطین دہلی کی دفاع اور سرکوبی کی کوششیں، عہد بلبن میں بنگال کے حاکم کی بغاوت اور اس کا فرو کرنا، عہد خلجی میں راجپوتانہ گجرات اور دکن کی مہمات، علاء الدین کی اصلاحات، مبارک شاہ خلجی کا قتل، ... غیاث الدین تغلق کے معرکے اور تخت نشینی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کے بارے میں امیر خسرو کے بیانات حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ امیر خسرو نے اپنے عہد کے پہلے مورخ ہیں جنھوں نے مروجہ رسوم و رواج، صنعت و حرفت، معیشت و معاشرت، علوم و فنون اور عقائد و مسالک پر توجہ کی اور بیش قیمت معلومات ہمارے لئے چھوڑیں اس عہد کے بعض اہم واقعات کی تاریخوں کا تعین امیر خسرو کی اعانت کے بغیر ناممکن تھا۔

امیر خسرو کے سوانح نگار ڈاکٹر وحید مرزا ان کی بذلہ سنجی اور ذوق لطیف کو، ان کی رواداری اور وسیع المشربی کو، سخاوت کو، صاف گوئی اور غیر منافقانہ رویے کو، ان کی ہمہ گیر شہرت و مقبولیت کے اسباب میں شمار کرتے ہیں۔

امیر خسرو کی اہمیت اور معنویت اس وقت ختم نہ ہوگی جب تک کہ انسان، اس کی تاریخ اور اس کے احساس و اظہار کے تجربات میں ہماری دلچسپی ختم نہ ہو جائے۔ اپنے عہد کے سب سے بڑے سیاسی سربراہ یعنی بادشاہ کے مصاحب، اپنے عہد کے سب سے بڑے ولی کامل یعنی حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے مرید اور اپنے عہد کے سب سے بڑے فن میں یکتا فنکار شاعر، حضرت امیر خسرو بیک وقت متناقض و متخالف جہتوں میں سفر کرنے کے سلسلے میں ایسے چراغ راہ ہیں جسے بدلنے والے اَدوار بجھا نہیں سکتے۔

یک مست زارم تو اند خرید کس
زیرا کہ کس بہشت بریں را بہانہ کرد

نقی محمد خاں خورجوی

واقعات سے ظاہر ہے کہ اس کے زمانے میں ہندوستانی موسیقی پر صدہا، مقصد وضع یک گانوں یک محدود تھی جو سنسکرت اور برج بھاشا میں گائے جاتے تھے امیر نے سب سے پہلے عجمی موسیقی کے انداز پر ترانہ، قول، نقش و نگار، گل وغیرہ گانے ایجاد کیے۔

باوجودیکہ اسلام میں علماء نے موسیقی کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن ایک گروہ صوفیوں کا ہر زمانے میں ایسا ہی رہا ہے جو تصوفانہ غزلیں گا کر روحانی سرور حاصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ شمس الدین التمش کے زمانے میں ان کے قاضی سعدالدین عماد اور مصباح السراج کے اثر سے موسیقی غیر اسلامی شعار قرار دے دی گئی تھی۔ لیکن چشتیہ قاضی حمیدالدین ناگوری کی تبلیغ اور اثر سے دہلی کے لوگوں میں دوبارہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بلکہ ایک زمانے میں تو وہ صحبت ہائے سماع کے رکن تھے۔

شمس الدین التمش نے بھی پابندی کے حکم کو منسوخ کر دیا تھا۔ اور دربار میں بھی اس کی اجازت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا فیروز شاہ بھی موسیقی کا بحد دلدادہ تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۷ء یعنی ایک ہی سال میں اپنی سلطنت اس شوق پر قربان کر دی۔

شاہ بلبن کے دور میں بھی موسیقی مقبول رہی۔ اس کے دربار میں عبداللہ ترکی ایک مشہور گویا بھی تھا۔ اور شیخ بہاء الدین ذکریا کے مریدوں میں سے تھا وہی زمانہ امیر خسرو کا تھا جنھوں نے اپنی "قران السعدین"، میں کیقباد کی موسیقی کے حالات درج کیے ہیں۔

اس کے پچاس سال کے بعد ۶۸۶ھ میں جب کہ معزالدین کیقباد تخت نشین ہوا اس کے زمانے میں موسیقی کا عروج تھا اور تمام ہندوستان سے گانے والے اور گانے والیاں سمٹ کر دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔

جلال الدین فیروز خلجی کے زمانے ۶۸۹ھ میں نامور مغنی محمد شاہ چنگی، فتوحا، نصرت خاتون اور مہر افروز وغیرہ موسیقار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاؤالدین خلجی کے زمانے ۶۹۵ھ میں زیادہ تو نہیں لیکن کچھ سلسلہ موسیقی کا جاری رہا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ محمد تغلق کے دربار کا سب سے بڑا گویا اور اس کا داروغہ ارباب نشاط امیر شمس الدین تبریزی تھا۔ الغرض اس زمانے میں دکن اور خصوصاً دولت آباد میں موسیقی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس طرح تمام ہندی موسیقی پر عجمی موسیقی کا کافی اثر پڑا۔ اور جس طرح ساز آرن اوپیہ نے عربی کی دھنیں فارسی گانوں میں منتقل کر دیں اسی طرح نائک سائلوں کے معنوں نے اسے ممالک کی دھنیں ہندوستان میں آن کر گائیں اور نئے نئے راگوں کی بنیادیں قائم ہو ناشروع ہو گئیں یہ اسی میل جول کی برکت ہے کہ عجمی موسیقی کے عام پسند راگوں میں رنگ دھن کو اپنے اپنگ اور رحمان کو بھی اوڑھ کر رچکا کیسے ہیں۔ اسی طرح زیلف، ایمن، درباری، عشاق، سرپردہ، کھماچ وغیرہ اسی موسیقی کی پیداشدہ یادگاریں ہیں، جو آج مقبول عام ہیں

بحر اور اوزان

چونکہ گانے کا تعلق نظم سے ہے اور نظم بلا کسی بحر کے نظم نہیں کہی جا سکتی اور بحر کے واسطے اوزان کا ہونا ضروری ہے کیونکہ بلا اس کے تال اور رسم کا قائم نہیں ہو سکتا اس وجہ سے امیر خسرو نے بحر اوزان اور تال سم کے بھی قواعد مقرر کیے ہندی گانوں کا دار و مدار سُر، لے اور تال سم پر ہے۔ فارسی میں اسی کو نغمہ، ادارہ اور اوزان کہتے ہیں اور تمام عجمی گانوں کا دار و مدار دائرہ اور نغمہ پر ہے۔

ہندی تالوں میں ساڑھے بارہ تالیں تلاتی جاتی ہیں۔ اور امیر نے چوبیس بحریں تالیں ایجاد کی ہیں جن کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

بحر ہزج، بحر رکی، بحر دو یک، بحر دور، بحر ثقیل، بحر خفیف، بحر چہار ضرب، بحر دراز، بحر باس، بحر ضرب الفتح، بحر فاختہ، بحر رمل، بحر متقارب، بحر طویل، بحر رجز، بحر کامل، بحر بسیط، بحر سریع، بحر منسرح، بحر مربع، بحر مجتث، بحر مرتفع، بحر مقتضب، بحر وافر۔

قواعد تقطیع

تقطیع کو زیادہ سریع الفہم بنانے کی غرض سے ہر بحر کا تعلق اوزان اور موسیقی سے بتلانے کی غرض سے ذیل کا طریقہ پیش کیا جاتا ہے تقطیع اوّل متقارب المسمن کو طبلہ کے ایک تالا ٹھیکہ کے ساتھ سمجھیے۔

کریمانہ بخشائے بر حال ما   کہ ہستم اسیر کمند ہوا

یہ لو ہے شعر۔ بحر اس کی فعولن فعولن فعولن فعول ہے۔ اس بحر کے گویا چار حصے ہیں۔

موسیقی سے ان ٹکڑوں کی یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے ایک تالا ٹھیکہ

مقرر فرمایا ہے۔ یعنی دھی۔ ترکٹ۔ دھنا۔ دِھا۔ تو۔ تا۔ کتا۔ گانے میں اس تال کی ضرب بار بار چلی جاتی ہے۔ اور دوسری تکی پر صورت ختم کی ہے۔ اور بحر اس لفظ مول رکن چہارم پر ظاہر ہوتا ہے اور آٹھویں بحر المثمن السالم میں بھی کہ جس کے چار لفظ حصے برابر ہیں۔ ٹھیکہ ایک تالا نہایت موزوں ہے اور ٹھیکہ جھپ تالے میں بھی یہ وزن سمجھ لیا ہے۔ ضرب کے علاوہ دونوں تالوں کی ایک صورت ہے۔ چنانچہ چوتالا دھرپد کا ایک ہی طرح ایک تالے میں گانا بجانا ممکن ہے۔

حضرت امیر خسرو نے بحر رمل المثمن المحذوف کا وزن تالا تال فارسی میں موزوں کیا ہے۔ یہ تالا چار ضرب کا ہے یعنی تین بھری اور ایک خالی۔ اور ان تین میں سے دوسری یعنی دھگے کی ضرب پر سم ہے۔ اس طرح بر چار رکن بحر مذکور کے ہیں مثلاً فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن۔

تقطیع بحر یہ ملاحظہ ہو۔ مصرع یہ ہے۔

"اے میارے کہ میاں بجھو موتے ور کر"

اے میارے	کہ میانت	بچھو موتے	ور کسر (خالی)
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن (خالی)
تا دھن دہا دہا	دھن دہا دہا	دھن دہا دہا	تن تا (خالی)

غور فرمایئے کہ تن تا کا درجہ خالی رہا اور فاعلن آخری رکن خالی پر پڑتا اور لفظ در کر کے مقابلہ میں خالی دھی اور دوسرے رکن کے فاعلاتن پر سم ہے اور اس سے پہلے لفظ کے اوبرسم ا اور اس سے مقابلہ میں دوسری دھی پر سم ہے۔

یہ تال چار ضرب کی کہلاتی ہے جس میں تین ضرب بھری اور ایک خالی ہے۔ بحر خفیف المسدس المحذوف جس کا وزن تال سول فاختہ پر ہے۔ اس میں چپک تال ہے اور یہ دونوں تین تین ضرب کی ہیں۔

اے مطلت رسک مشک تاتارے ذوق بحر حصف گردآرے

سول فاختہ میں دو ضرب اوّل کی برابر ہیں اور ایک ضرب آخر میں وقفہ دے کر پڑتی ہے۔ پہلی ضرب فا پر اور دوسری ضرب لا پہ اور تیسری ضرب معاعلن کا دھچھوڑ کر بطور وقفہ حصہ سوم کے لعطاتن پر پڑتی ہے۔ مذکورہ بالا شعر کا وزن اور ٹھیکہ یہ ہوگا۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن۔ یہ ٹھیکہ سات لفظ کا ہے۔ یعنی دھ دھ تٹ دھا۔ دھ۔ تٹ۔ اس کی اوّل ضرب خود سم ہے۔ پہلی دھ پر اور دوسری تک پر اور تیسری ضرب۔ دوسری تٹ پر اور تیسری ضرب دوسری تٹ پر ہونی چاہئے اور تال چپک میں ضرب۔ اول کے حرف فا پر اور دو ضرب برابر رکن دوم فاعلن کی ضرب کا آخری حصہ دوسرے رکن سوم کی طرف فا پہ۔ اور تیسرے لعطاتن پر پڑنا چاہئے صرف اس قدر فرق سول فاختہ اور چپک میں پایا جاتا ہے البتہ منقلب کرنے سے تال تبدیل ہو جاتی ہے۔

امیر کی ایجاد تال سم

اس ایجاد کے سلسلے میں ماہر موسیقی دولت شاہ اور حکیم محمد کرم خاں وغیرہ نے لکھا ہے کہ امیر نے پکھاوج کی بجائے ڈھولک اور طبلہ ایجاد کیا۔ اور ان کے بجانے کے قواعد مقرر کر کے امیر نے سترہ تالیں قائم کیں۔ جن میں فارسی کے قواعد کو بھی ملحوظ رکھا۔ یعنی اوّل جسے پانچ تال سواری چار تال، فرودست پانچ تال، پہلوان چار تال، چپت تین تال، ربانی سواری پانچ تال اور سات تال، یکتو ایک تال اور اگر ضرب کی دم دی جائے تو تین تال کی صحیح ہے۔ آڑا چوتالا چار تال، قوالی تین تال، دودھمس تال، جھومرا تین سال اور یک تال ہندی ہے) سول فاختہ تین تال رہتا ہے ہندی کی چپک تال ہے) جس کے معکوس کرنے سے سول چپک اور چپک سول ہو جاتی ہے۔

فارسی ترانہ مع تال اور سم

تنم درنا نادر در نم — تہ در نا نادر در نم

دوییک — دورویہ
وشس وستس لو ن — وش وش لوں دتن وش لون

روانی — بسیت
وش تک وشں لو ں — وستں لوں وش دتن لو ن

یم دور — چپ انداز
وش لو ں تک وشں — وشں نہ وستں لون
دں دتں لوں

تالہ — یم منتقل
وشں نہ وشں لو ں — تک تک تکادتن تکادتن تک تک
تکادتن تکادش دش لو ں

خمو — مخمس
دتن لوں لک وستں وش — لک لک لکادستں لکادسں
لوں دتن دتن لوں لو ں — لوں وش دس لک لک لکھادتن

سماعی — دور حقیقی
وش دتن لوں لکہ دتن لو ں — دش لوں لوں دش لو ن
وستں دتں ــــــ لوں — لوں دتن لوں دتں لو ن
دتن وش لو ں وشں لوں

تک ضرب — وشں لک وشں لکہ
لک لک لکادستں — ضرب فاختہ
دتن دش لوں لوں دش دتن — وستں دتں لو ن

قلبانہ

قلبانہ کی اصل قلبنہ ہے۔ امیر خسرو نے زبان عربی کو ہندی میں ملایا ہے۔ تال سواری اور تتالا استائی بول ہیں۔ لقد صدق قولہ تعالیٰ "الترا" امیر خسرو بل بل جاویں حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار گاہ میں۔

قلبانہ اور قول کہ جس کی اصل قول ہے کچھ عربی اور کچھ الفاظ ترانے کے ملا کر

ایجاد کیا ہے۔ اسماقی تال تتالہ ۔ حی در در تالا لالے ۔

حسن و نظام الدین اولیا۔ دم یم ور دو در رتنے۔ تان یہ ہے تلے تنانانا نانا ما ما ترا ۔ ہے ماما تو لو صمؔ وجہ اللہ درکم ، رتم توم توم تنا ما ما ما۔ در دے لے تلے دراحام دیم یم ور در در در تنے تان لے ماما ما اس کے بھی انترے سے تال بدلتی ہے اور نقش گل میں تال ہیں بدلتی ہے ۔ اکثر یہ تال پشتو اور قوالی میں گائی جاتی ہے ۔

نقش سے مراد رباعی اور گل سے مت ہے گویا مختصراً ایک شعر ہے۔ بقیہ ادروں میں تالیں بدلتی ہیں اور دہرپد کی بجائے کہ اس میں چار یا پانچ چرن ہوتے ہیں (اور بعض میں دو چرن بھی ہوتے ہیں) امیر نے خیال معرر کیا۔ جس میں صرف دو ہی چرن ہیں۔ لیکن تانیں اس میں خراو بھی زمرمہ پر رکھیں جس کو بی رہار گٹکری کہتے ہیں ۔

اصلیت یہ ہے کہ ہندی میں پہلے گٹکری تھی اور اب بھی اس میں دالے کا بڑا عیب میں داخل ہے ۔ اسی وجہ سے امیر نے اس کی بجائے پرید کا ترانہ بنایا اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ سننے والوں کے علاوہ جو گانے والے تھے وہ بھی حیرت رہ گئے ۔

ڈھولک اور طبلہ بھی پکھاوج پر غالب آگئے ۔ اسی طرح ستار کے بولوں نے بین کے بولوں کو ترما دیا ۔ اس زمانے میں بھی قوال تقریباً ہر جگہ موجود ہیں لیکن ایسے سب کم ہیں جو قول اور قلبانہ سے کوئی واقف ہوں ۔ ورنہ عام طور پر جو خیال وغیرہ گاتے ہیں وہ بھی قوال کہلاتے ہیں ۔

جیسا کہ شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ امیر نے دہرپد، دھمار، ماتھا، چندرو، ترنکت، گیت، وہرپد کی بجائے خیال، قول، قلبانہ، نقش گل اور ترانہ ایجاد کیے اور جس طرح پرپد دھمار، ماتھا اور چندرو کی تالیں بدلتی ہیں اسی طرح قول قلبانہ وغیرہ میں بھی تالیں بدلتی ہیں ۔

قدرتی طور پر جوش اور جذبہ کی حالت جو الفاظ ماتے ہو وغیرہ کے نکلتے ہیں ۔ ان کو حضرت امیر نے ان الفاظ میں منتقل دیا یا ۔

تا تو ن بر ور ن تو ۔ وان بر ور ن جان وایں مقرر کر کے الاپ موزوں کیا ۔ مقرر کیا ۔ اس سے زیادہ الاپ اس قسم کی قوالی یعنی خیال، قول، قلبانہ، نقش گل اور ترانے میں نہیں ہیں اگر ہیں تو معیوب ہیں ۔

یہ راگ گویا امیر کی امانت ہیں ان میں ترمیم تسخ اور اس امانت میں خیانت ناروا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے رفتہ رفتہ یہ راگ معدوم ہو جائیں گے یا ان کی شکل تبدیل ہو جائے گی ۔ الاپ یا مُرکی اور گٹکری ایک جداگانہ چیز ہے جو گانے کو پُر لطف بناتی ہیں ۔ لیکن ان سے اشعار کے الفاظ کٹ جائیں اور ناقابل فہم ہو جائیں تو وہ عیب میں داخل ہے ۔ اس کے گانے میں جو تان لی جائے وہ بھی اسی راگ کی ہونی چاہیے جس میں وہ غزل گائی جا رہی ہو ۔ اگر ان دونوں باتوں کا لحاظ نہ رکھا گیا تو قوالی بے لطف ہو جاتی ہے ۔

ترانہ

ترانہ بہ وزن فسانہ دلفظ تنا بروزن شنا، یم دیم بروزن سر اور نا بروزن جا اور توم بروزن موم، تنا بروزن دنا، اس کے علاوہ اور حروف معروفات مثلاً تا، دال، نون، الف، یا، میم، را، واؤ یہ آٹھ حروف ہیں ۔ ان کے علاوہ ہر کٹ ترکٹ بروزن سلوٹ مستعمل ہیں اگر آٹھ حروف سے زیادہ ہوتے تو ترانے کے شمار سے باہر ہو جاتے ہیں ۔

امیر نے ترانہ بزبان فارسی ایجاد کیا یعنی درآ آ۔ درآ آ۔ ورتم۔ درآ جان من درآ۔ درآ ۔

تنگ آمدہ ام جیدا انتظار کشم
یا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم

ترانہ سوہنے کا اور تال فرودست کی ہے ۔ دراصل اس کی تال جس کی ہے ترانہ یہ ہے ۔ درآ درا تلے ۔ دردانے ناانتل لائیے ۔ انتل لائیے تلالیے ۔ پہلے کی خالی سے شروع ہے ۔

سردی دلتوجی تم چوخسرد
ہزاران عاشقان بر کنندہ باشی

ستار

امیر نے بین کی بجائے ستار ایجاد کیا ۔ بین میں سات تار دو دو ہی اور چار ہیں ہوتی میں اور دو مضرابوں کو چھنگلیا انگلی میں پہن کر بجائی جاتی ہے وہ سارجس میں تار ہونے میں ان کے بجانے کے صرف دو ہی طریقے ہیں یا تو مضراب سے یا ناخن کے کانچے سے ۔ مضراب کو تت اور کانچہ کو تب کہتے ہیں ۔ اور لکڑی کے ٹکڑے کو جس سے بجاتے ہیں ۔ اس کو گز کہتے ہیں ۔

ستار کا اصلی ابتدائی نام سہ تار اور سرود کا سہ رود ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان دونوں باجوں میں پہلے صرف تین تار تھے اور تین تانت تھیں ۔ امیر نے ستار میں ایک تار آہنی اور دو ریشمی لگا کر بعض تو سہ سے بین کی مثال بنا دیا ۔

ستار میں ایک سپتک کامل اور دو سپتکیں ناقص ہیں ۔ یعنی سپتک اول مدھم سے سپتک میانہ تک اور دوسپتک دوم) سپتک میانہ سے گندھار تک ۔ ایک سپتک زائد چڑھی ہوئی خط گندھار تک ہوتی ہے جس کو امیری سپتک کہتے ہیں ۔ البتہ بیچ کی سپتک کامل ہے ۔

حضرت امیر نے جو قواعد مقرر کیے وہ یہ ہیں ۔

بیچ کی سپتک کو کامل کیا، جب یہ تین سپتکیں مقرر ہو گئیں تو ترتیب کے ساتھ اس میں چھ تار اس طرح پر رکھے کہ ۔

اوّل تار بات کا، دو تار ریشمی کھرج کے، ایک تار آہنی پنچم کا، ایک ریشمی گنڈو اور پھر ایک تار آہنی اس کے برابر جس کو چکاری کہتے ہیں، جو تار ریشمی ہیں وہ کھرج کہلاتے ہیں، جو باج ہیں ان کو بہ حساب مدھم کوک کہتے ہیں سیدھے ہاتھ کی طرف کھرج آہنی اور ریشمی ہوتی ہے، پنچم اور چکاری ہم ور در مدھم ہوتے یا سُر کے مطابق ہوتے ہیں اور سپتک دوسری اور تیسری میں کام آتی ہے ۔

وادی سُر ما ہے اور سم وادی سا ہے۔ دن کے وقت گایا جاتا ہے۔
آروہی۔ اس کی سا۔ رے۔ ما۔ پا۔ دھا نی۔ سا۔ ہے۔
امروہی۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ رے۔ سا۔ ہے۔
خیال اسس راگ کا ایک تال کا ہے، الفاظ یہ ہیں۔
سانچی دہ ن سانچی مورن، سانچو راگ سانچی تان
جوکوئی گاوے تال سُرن میں واکو گنی مان
تال سُرن کھسدھائے کال اکالی پہچانے
جو آپ کو جانو مستہرو واکو بڑو گیان

راگ موافق

یہ راگ گوڑتی مالوتی اور دوگاہ سے بنایا ہے۔ آخر الذکر فارس کا راگ ہے۔ پا اس کا وادی ہے اور سا سم وادی ہے۔ صبح کا وقت گانے میں مرادمتا ہے۔ گوڑتی میں دھا وادی ہے۔ اور مالوتی میں رے۔
آروہی۔ اس کی سا رے گا پا دھا سا
امروہی۔ سا دھا پا گا رے سا۔
خیال۔ تین تال۔
ن کے تجھی سمجھے باورے ایسی من سحاتی سانورے۔
تارتا رکی تادرانی جھوم رہی سب ہی کی ٹھاری۔
پن گھٹ کی مہاری ٹھاڑی تھول گئی خسرو بھیا ہرن کو

راگ غنم

یہ راگ اوڈو اوڈو یعنی پانچ سُر کا ہے۔ پوربی اور ترمینی جس کو تروِن کہتے ہیں، اس سے بہت ملتا ہے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ امیر نے پوربی راگ میں تھوڑا سا تغیر کر دیا ہے۔ یعنی پوربی میں کڑی مدھم ہے اور اس میں مدھم نہیں ہے۔ بھیروں میں اتری رکھب وادی ہے۔ اور اس میں پا وادی ہے پوربی میں سرگا۔ وادی کہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ترون شری راگ کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ اور اس کی طرز پوربی راگ کی طرح پر ہے۔ گانے کا وقت شام کا ہے۔
آروہی۔ سا۔ رے گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔
امروہی سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ گا۔ رے۔ رے۔ سا۔
خیال راگ غنم تال تین تال۔ الفاظ یہ ہیں۔
ارج سنو موری آج پیر مورے چرن چھوئے
کی لاج راکھو مورے پیارے۔ خسرو تم بدھاؤ
دہیر مورے پیر

راگ زیلف

یہ بھیروں ٹھاٹ کا مشہور راگ ہے۔ اور امیر کی عجیب ایجاد ہے۔ عام گویئے اس کو گرم گاتے ہیں۔ یہ راگ مشرمل کا ہے اور کئی ٹھاٹ ملاکر بنا ہے، اسکی اراگ میں کانڑے اور بھیروں کا رنگ دکھلاتا ہے۔ امروہی میں رکھب ورجت ہے دھیوت کا سُر وادی اور گندھار کا سُر سموادی ہے۔ گانے کا وقت پہلا پہر دن ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ اس میں جونپوری اور کھٹ بھی شامل ہے۔ اس لئے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ اس راگ کو بھیروں سے الگ کرنے کے لئے رکھب کا سُر بہت کمی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔

"سرمایۂ عشرت" میں لکھا ہے کہ اس راگ کا ٹھاٹ کانگڑے کی طرح رہے یعنی کھرج پنچم، اچل رکھب مدھم اور دھیوت کومل ہیں گندھار اور نکھاد تیور ہیں اور ادچار اس کا دھیوت سُر سے ہوتا ہے۔ اسس لئے گانے کا وقت آخر شب ہو سکتا ہے۔
آروہی۔ سا۔ رے۔ گا ما پا دھا نی سا
امروہی۔ سا نی دھا پا دھا ما گا ما سا
ترانہ ٹھاٹ آساوری۔

تال جھپ تال

دردرتوم نادر دَرتوم نادرے رے تاتا
نادارے دانی تا آتوم تانانے تے نا نا
تے دارے دانی
پائے سگ بوسیدہ مجنوں خلق پرسگ ہسی
گفت این سگ گاہے گاہے کوئے لیلیٰ رفتہ بود
خیال۔ ٹھاٹ بھیروں، تال تین تال بول یہ ہیں۔
سب نگر آسار مدھاوالاری مالیاں
پھولن دے سہرا سب جگ میں جیوا سارا
سب حضرت جسم پایوس منگل گایو

راگ فرغانہ

یہ راگ دیس کار، دیوسا کھ، گوجری، گوتکر، سرتھی، سندھو، سندھوی، ونت، مادونت، ترون، کھوپالی، اشٹ منگل، بھیروں، مارواا ور بنگال وغیرہ امام کے راگوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ گوترا اور گن کلی سے یہ راگ مرکب ہے۔
آروہی۔ گن کلی بھیروں ٹھاٹ۔ سا۔ رے۔ ما۔ پا۔ دھا سا۔
امروہی۔ سا دھا پا ما رے سا۔
بھیروں ٹھاٹ کی گوتری آروہی۔ سا رے گا ما پا دھا نی سا۔
امروہی۔ سا نی دھا ما گا رے سا۔
فرغانہ تین تال بھیروں ٹھاٹ
آروہی۔ سا رے ما ما۔ گا۔ پا۔ نی۔
امروہی۔ دھا۔ نی۔ سا۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ پا۔ گا۔ ما۔

وادی ۔ رکھب ۔ ما ۔
سموادی ۔ ما ۔
گانے کا وقت دن کا ہے ۔

بول

ہے ہے نظام الدین جگ تارن تاینس پران کردارن
خسرو کے پریجو احمد کے یوس تن من اور دھن کردوں تارن

راگ سرپردہ

یہ بلاول ٹھاٹ کا سمپورن راگ اور بلاول کی ایک قسم ہے۔ گانے کا وقت پہلا پہر دن ہے۔ بعض اسس میں گندھار کو وادی مانتے ہیں اور بعض دھیوت کو۔ کیوں کہ یہ راگ صبح کا مانا گیا ہے، اس میں تو گندھار کا وادی ہونا صحیح نہیں ہے۔ کھرج اور پنچم وادی سموادی سُر ہیں۔

امروہی میں بلاول کی شکل کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ بیہاگ کی بھی شکل نظر آتی ہے۔ لیکن بیہاگ میں نکھب دربل یعنی کمزور ہے اور اس میں صاف ہے۔
بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ راگ ایمن ایا اور گوند سے مرکب ہے۔
آروہی ۔ سارے گا ما دھا پا دھا نی سا ہے ۔
امروہی ۔ سا نی دھا پا نی دھا پا ما گا ما رے سا ہے ۔
خیال راگ سرپردہ تال تین تال ۔ بول یہ ہیں ۔
"سلطان جی صاحب نظام الدین اولیا رتو ہے
ل ل جاؤں مو ہے پیر بوسوں دیا چرن تیرے
گئے خسرو پایا میں نے ایسا الیو پر مور رے تم نظام الدین اولیاء"

راگ باغرو

اسس میں ایک راگ فارسی شامل ہے۔ جس کے نام کا پتہ نہیں چلا۔ اس میں گا وادی اور دھا سموادی ہے۔ گانا آسان ہے۔ اس راگ کا کوئی خاص وقت معین نہیں ہے۔ راگ سمپورن ہے۔
آروہی ۔ سارے گا ما پا نی سا ہے ۔
امروہی ۔ سا نی دھا پا ما گا رے سا ہے ۔
خیال راگ باغرو تین تال الفاظ یہ ہیں ۔
دل من دل من دل من این آوارہ ۔ دل من
پارہ پارہ دل من، این بے چارہ ۔ دل من
دل من دل من دل من این دلوارہ دل من عاشق
جاناں دل من، این پروانہ دل من
خسرو در عشق حراب، ہم چو ماہی بہ سراب مو تے
دل من بہ شتاب۔ این دیوانہ دل من

راگ صنم

یہ راگ کلیان اور بلاول کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ ایمن کلیان اور ایک فارسی راگ ہے جس کو لورد۔ اور لورچکا بھی کہتے ہیں۔ یہ راگ آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ شدھ سارنگ اور نام کلیان سے ملتا ہے۔ مگر آج کل جو شدھ سارنگ مروج ہے اس میں کومل نی یعنی نکھاد اور تیور گندھار نہیں ہے۔ کافی ٹھاٹ کی ساتی کومل گندھا اور کومل نکھاد ہے پس ان دونوں سروں کا شدھ سارنگ میں رہنا اس راگ کو قاعدہ سے ہٹنے دیتا ہے۔ شدھ سارنگ میں گندھار نہیں ہے اور صنم میں گندھار مدھم موجود ہے۔ شدھ سارنگ میں کومل نکھاد انوادی سُر ہے صنم راگ میں یہ سُر لگتے نام ہے۔ شدھ سارنگ کا پاس یعنی حاتمہ رکھی پہ ہے اور اس میں رے پہ ہے۔ تام کلیان اور شدھ سارنگ میں دونوں مدھم ہیں اور اسس میں بھی دونوں مدھم ہیں۔ اس طرح پر آروہی میں تیور اور امروہی میں کومل ہے، شدھ سارنگ اوڈو، اوڈو یعنی پانچ پانچ سُر کا راگ ہے اور صنم کاڈو سمپورن ہے۔ یعنی چھ سات کا۔
آروہی ۔ سارے ما پا دھانی سا ۔
امروہی ۔ سانی دھا پا ما گا ما رے سا ۔
گانے کا وقت رات کا ہے ۔
خیال صنم ایک تال ۔ الفاظ یہ ہیں ۔
"اندھیری گھٹا کالی جس چراغ علاج دل آکر خسرو کہے یاغ"
خیال دیگر صنم تین تال الفاظ یہ ہیں ۔
نظام الدین پیر اولیا نظام الدین شان انما خسرو
آن پڑے جرن میں کہ پاکر و سہر کبریا

راگ زنگولہ

اسس راگ کا تعلق دو راگوں سے ہے یعنی بھیروں اور آساوری اس لئے اس میں دونوں دھنیں لگائی جاتی ہیں۔ مگر شدھ دھیوت کی کے ساتھ لگتی ہے جس میں بلاول کی صورت نظر آتی ہے مگر اصلی رنگ بھیروں ہی کا رہتا ہے۔ گانے کا وقت صبح کا ہے۔ اس میں دھا وادی ہے اور رے سموادی ۔
آروہی ۔ سارے گا ما پا دھانی سا ۔
امروہی ۔ سانی دھا پا ما گا رے سا ۔
خیال ۔ ایک تال بھیروں ٹھاٹ
من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی
سوزم گرت نبینم میرم چو رخ نمائی
دھرپد راگ زنگولہ آساوری ٹھاٹ تال ایک تال
بھور بھئی سکھی ری ملن کا ہے، کوکرت ہے آسی چوراجائی رے۔ سات سکھی مل ہنگل گاویں ہوویں چوک پر اور جا ورے ۔
انترہ دیگر سیمانی متان میں نے تم بھو پایک خسرو کرت آسنی گن گا یوسے
من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی + سوزم گرت نبینم میرم چو رخ نمائی

ماہرؔ القادری

○

اے شہنشاہِ تغزل! اے امامِ فکر و فن — تیرے شعروں کی روانی موجۂ گنگ و جمن
اللہ اللہ تیری غزلوں کا مزاجِ رنگ و بُو — جس طرح غنچے کنول کے، جیسے گلہائے سمن
تیرا لہجہ نغمگی کی روح، موسیقی کی جان — لفظ و معنیٰ کی جوانی تیرا اندازِ سخن
سعدی و حافظ کی صف کے شاعرِ شیریں نوا — تو کہ اپنی ذات سے تھا فارسی کی انجمن
بس ترے خوانِ کمالِ شعر کے زلّہ ربا — رند ہو یا پارسا ہو، شیخ ہو یا برہمن
امتزاجِ شعر و نغمہ، ربطِ آہنگ و نوا — ہے اسی فن کی بدولت اتحادِ جان و تن
کہہ مکرنی ہو پہیلی ہو کہ ہوں وہ لوک گیت — طفلِ اُردو کو پہنایا تو نے پہلا پیرہن
تو ہے خود اپنی جگہ شعر و سخن کی روشنی — جگمگا اٹھے ترے افکار سے کوہ و دمن
ندرتِ لفظ و بیاں بھی، جدّتِ تخئیل بھی — ہے سلاست میں نزاکت سادگی میں بانکپن
مُوجدِ عشاق اے نغمہ نواز و نغمہ گر — راگنی دیوی نے خود آکر چھوئے تیرے چرن
صاحبِ فکرِ رسا اے شاعرِ شیریں نوا — ہر غزل کا تیری مطلع صبح کی پہلی کرن
تیری پرگوی کی مل سکتی نہیں شاید مثال — شعر خود ہوتے تھے موزوں ارتجالاً دفعتن
بحرِ عرفاں کے شناور، صاحبِ حال و مقام — تیرے دم سے لہلہا اٹھا طریقت کا چمن

آمدم در بارگاہت نغمہ سنج و مدح خواں
ہدیۂ ازمن بگیر اے خسروِ ملکِ سخن

جمیل مظہری

○

یہ کس کے ذہنِ رسا کے سانچے میں پل رہے ہیں نئے تصور
یہ کس کے جوشِ عمل کے سانچے میں ڈھل رہا ہے نیا زمانہ
یہ کس کے افسونِ ادعا نے طلسم صدیوں کے توڑ ڈالے
اجڑ گئیں ساری بارگاہیں، پلٹ گیا سارا کارخانہ
نہ وہ سیاست کے آشیانے، نہ وہ شریعت کے آستانے
نہ وہ ہوس کے قمار خانے، نہ وہ خرد کا نگار خانہ
تصورِ رنگ و بو بھی بدلا، طبیعت آب و گِل بھی بدلی
فسانے بننے لگے حقیقت حقیقتیں بن گئیں فسانہ
جو راکھ کے ڈھیر رہ گئے ہیں وہ اب اُٹھیں گرد راہ بن کر
ہوا کی رفتار کہہ رہی ہے کہ قافلہ ہو چکا روانہ
بجھے چراغوں میں روشنی ہے، نشیلی آنکھوں کی نیند اڑی ہے
جمیل کی بانسری نے چھیڑا ہے شام سے صبح کا ترانہ

ساغر نظامی

ادب اے جہانِ حاضر یہ ہے بزمِ خسروانہ
ہے یہاں ازل ترنم، ہے ابد یہاں ترانہ
ہے ہر اک گدا کو حاصل غمِ عشق کا خزانہ
کہ رموزِ فقر سمجھے مرا خود غرض زمانہ
ترا نقشِ پا جہاں تھا وہیں اک آستانہ
کہ اگل دیا زمیں نے کوئی گمشدہ خزانہ
کبھی آہ صبح گاہی کبھی نالۂ شبانہ
ہے وظیفۂ مسلسل ترا سوزِ عاشقانہ
تری انگلیوں میں بربط تری جنبشوں میں نغمے
ترا ہر نفس ترنم، ترا ہر نفس ترانہ
نہ یہاں ہے کوئی ہندو، نہ یہاں کوئی مسلماں
کہ ہے کعبۂ محبت ترا سنگِ آستانہ
ہو مبارک آسماں کو یہ فروغِ ماہ و انجم
کہ ہے کہکشاں سے بڑھ کر تری خاکِ آستانہ
نہ ٹھہر سکا جبیں میں مری بندگی کا طوفاں
جو فضا میں جگمگا یا ترا سنگِ آستانہ

مظفر الدین خاں

(۱)

اے ہند کی اقلیمِ سخن کے مختار
حافظ نے کئے تھے حفظ تیرے اشعار
تو طوطیٔ ہند ہے امیرِ خسرو
آتی ہے ترے نام سے گلشن میں بہار

(۲)

تو ہند میں ہے ملکِ سخن کا بانی
ہے زیب تجھے خسروی و سلطانی
ایران میں سکّے کا چلن ہے تیرے
تھا تیرا لقب مصر میں بھی خاقانی

(۳)

ہے عشق ترے خاتمِ ہستی کا نگیں
دیپک کی طرح سانس ہے آتش آگیں
تو شیخ میں اس طرح فنا ہے خسرو
ہیں تجھ میں فنا جیسے نظام حق ہیں

جگن ناتھ آزاد

○

السّلام اے شاعرِ روشن دل و روشن ضمیر   السّلام اے کاروانِ عشق و مستی کے امیر
اے امیرِ مُلکِ معنی، خسروِ دنیائے شعر   تیرے سوزِ دل سے تاباں چہرۂ زیبائے شعر
تاجدارِ کشورِ الفاظ و اسلوب و بیاں   دل ترا گنجینۂ معنی ہے لب گوہر فشاں
سرزمینِ ہند کے اے نے نوازِ پاک زاد   آج بھی تیری غزل میں ہے نہاں دل کی کشاد

اے بہارِ رنگ و بوئے بوستاں تجھ پر سلام
اے وقارِ کشورِ ہندوستاں تجھ پر سلام

ذات تیری بہر دیں مال و دولت کی حصول   "نعمَ مال صالح" ہے گفتۂ پاکِ رسول
عام اہلِ زر سے اونچا تھا کہیں پایہ ترا   درحقیقت فقر کی دولت تھا سرمایہ ترا
فقر یعنی اک نگاہِ راہ بیں، اک زندہ دل   روح آزاد علائق، جسم اسیرِ آب و گِل
فقر یعنی مستی کردار و تسلیم و رضا   دوسرے الفاظ میں گویا متاعِ مصطفےٰ

بسکہ مبنی فقر ہی پر تھی تری تطہیرِ فکر
نور کا پیکر غزل میں ہے تری تعمیرِ فکر

آشنائے رازِ ہستی، واقفِ ہر خیر و شر   دل کی دنیا ہے ترے افکار سے زیر و زبر
صبر کا شیشہ تری ضربِ سخن سے ریز ریز   تیرے نغمے سے گریبانوں میں پیدا رستخیز
جب تڑپ اٹھتا ہے تیرے شعر پر جذبِ دروں   کم نظر اس کو سمجھتے ہیں فقط جوشِ جنوں
فلسفے والے نہ سمجھیں گے کبھی یہ رازِ دل   گوشِ ظاہر تک پہنچتی ہے کہاں آوازِ دل
خاکِ تیرہ کو سراپا نور کر دیتا ہے تو   پردۂ انوار میں مستور کر دیتا ہے تو

رُوح یوں پاتی ہے تیرے فیض سے سوزِ دروں
مہر سے جس طرح پاتی ہے رگِ گل موجِ خوں

سید غلام سمنانی

ترے ہی ذکر سے، یہ نظم و اہتمامِ سخن　　ترے ہی حرف سے شیریں ہوا ہے کامِ سخن

سپہر شعر ہوا، تجھ سے مطلعِ انوار　　تو شمعِ بزمِ سخن ہے، تو مہرِ بامِ سخن

کہا ہے ژرف شناسانِ شعر نے تجھ کو　　خدیوِ مملکتِ شاعری، امامِ سخن

ترے خیال سے، آرائشِ رخ و گیسو　　تجھی سے صبحِ سخن ہے، تجھی سے شامِ سخن

ہے ترے ذکر سے معمور، محفلِ شیراز　　بلند تجھ سے ہوا کس قدر مقامِ سخن

کسی کا فیض نظر ہے شریک حال ترا　　ملی ہے تجھ کو جو یہ دولتِ دوامِ سخن

تری بہارِ سخن، گل فروشِ دشت و چمن　　ہر اک دیار پہ برسا، ترا غمامِ سخن

ہے تری بزم میں، پاکوب، شاہدِ معنی　　ہے ترے قدموں میں، مجوبِ لالہ فامِ سخن

ہر ایک تار ہے سازِ سخن کا، زخمہ فریب　　نہ اعتبارِ سخن ہے، نہ احترامِ سخن

ہیں جرعہ خوار ترے کب سے تشنہ و محروم　　نہیں ہے کوئی جو گردش میں لائے جامِ سخن

اُٹھ اور اپنے اس اعجازِ خسروی سے ذرا
درست، از سرِ نو، کر دے تو نظامِ سخن

سلام مچھلی شہری

○

زمین پر اگر دیوتا کچھ نہ ہوتے تو انساں شاید پریشان ہی رہتا
نظارے تو ہوتے بہاریں تو ہوتیں مگر گلشن فکر ویران ہی رہتا
حقیقت کا مفہوم واضح نہ ہوتا اگر دلنشیں کلپنائیں نہ ہوتیں
کوئی خاص منظر نکھر ہی نہ پاتا جو اس کے لئے کچھ فضائیں نہ ہوتیں

حقیقت کی ان ضوفشاں منزلوں میں، حسین خواب اب مسکرانے لگے ہیں
بزرگوں نے جو دیپ روشن کئے تھے وہی دیپ پھر جگمگانے لگے ہیں
کلا اور سنگیت کے دیپ پھر سے مقدس فضاؤں میں جلنے لگے ہیں
زہے عہد حاضر کہ حافظ کے بربطِ پہ میرا کے نغمے مچلنے لگے ہیں

مبارک کہ وادیٔ گنگ وجمن میں کلا کو نئی زندگی مل رہی ہے
مبارک کہ پھر طوطیٔ ہند خسرو کے افکار کی روشنی مل رہی ہے
نئی روشنی میں نئے تاج محلوں، اجنتاؤں کا جنم ہونے لگا ہے
ہمارے کلا مندروں سے قریب آج پھر پیار کا دھرم ہونے لگا ہے

ملی ہے ضیاء بار تعبیر جس کی وہی خواب پہلے بھی دیکھا گیا تھا
مبارک وطن کی سحر کہہ رہی ہے کہ آفتابوں کا اک سلسلہ تھا

شمیم کرہانی

○

مرحبا، خسروِ نوا گستر — طوطیِ ہند، نغمہ سنجِ بہار
ذہنِ خلاق کا ہر ایک عمل — فکر و معنی کا قافلہ سالار
رزم میں بے عدیل ترک جری — بزم میں بے نظیر موسیقار
مصحفِ نظم، رونقِ گلشن — صفحۂ نثر، غیرتِ گلزار
اس کی ہر بیت، اک شگوفۂ زر — اس کا ہر شعر، اک دُرِ شہوار
ہر رباعی میں زندگی کے رموز — ہر پہیلی میں ذہن کے اسرار
غزل اس کی لطیف تر ایسی — جیسے پھولوں کی نرمیٔ رخسار
کافرِ عشق و صوفیٔ صافی — بندۂ حق پرست و سجدہ گزار
عارضِ فن پہ غازہ و تابش — چہرۂ زندگی پہ گرد و غبار
بزمِ حرف و سخن میں نغمہ سرا — عشقِ محبوبِ حق میں سینہ فگار
اہلِ ایراں کو اعتبار آیا — ایسا محکم زبان کا معیار
بند راحت کے راستے لیکن — منکشف دو جہان کے اسرار
سرزمینِ وطن میں جذب ہوا — ایسا رکھتا تھا خاکِ ہند سے پیار

تجھ پہ اربابِ فکر و فن کا سلام
قصرِ اُردو کے اوّلیں معمار

بشیر النساء بیگم بشیر

اے عندلیب خوش نوا پروانۂ نظامِ دیں — روحانیت نواز ہے تیرا کلامِ دل نشیں
سلسلۂ نظامیہ ہے داستانِ خسروی

مردِ حقیقت آشنا تھا آستان پہ بدگماں — اور وارداتِ قلب تھے شیخ طریق پر عیاں
کس درجہ ناز آفریں تھا امتحانِ خسروی

دل ایک ہی نگاہ میں محرمِ راز بن گیا — اور اک کبوتر حزیں دم بھر میں باز بن گیا
عشق کی ایک جست میں بدلا جہانِ خسروی

درویشِ بے مثال تو شاعر بے نظیر تو — نازشِ خانقاہ تو نورِ نگاہِ پیر تو
فقر کی آن بان پر قائم ہے شانِ خسروی

ہند و تتار و پارس کو شیر و شکر بنا دیا — سب کی زبان سے تو نے اک جادو نیا جگا دیا
اُردو زباں کی جان ہے اب تک زبانِ خسروی

فرما رہا ہے پیر ہی شان میں، یہ مرید کی — من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
محبوبِ حق کی جان تھی لاریب جانِ خسروی

دامودر ذکی

○

خوبی و خلق کا حسیں پیکر — علم و فن کے کمال کا منظر
شاعرِ بے مثال، شیریں سخن — خوش گلو راگ، تال کا بہتر
ڈھولک اور جلترنگ اور ستار — ان کا موجد "خیال" کا ہمارر
عاشقِ دیں و صاحبِ عرفاں — تھا دلِ اولیا میں جن کا گھر
مہرباں جن پہ تھے نظام الدینؒ — اور شکستوں کا تھا یہاں نہ گذر
حسنِ الفت، خلوص کی تصویر — دین و ایماں کی روح کا منظر
گود میں جس کی گر ریاست کے — ہو رہے تھے جوان پل پل کر
زینتِ کیف و آبروئے سپاہ — زینتِ بزم و آبروئے ہنر
سب کی نظروں میں قدر کے قابل — سب کے دل میں بنا ہے جن کا گھر
ایک اوجِ مزاج دانی وہ — جس سے واقف تھے سارے اہلِ نظر
اور درباردارایاں دن رات — جن پہ کرتی رہی تھیں فخر اکثر
جن پہ ہر دل عزیزیاں تھیں نثار — اور محبت کو ناز تھا جن پر
وضع داری کو عشق تھا جن سے — پیار خودداریوں کو تھا یکسر

فیض پاتے تھے سب بقدرِ ظرف
ایک جا جمع تھے بہت سے ہنر

شہباز صدیقی امروہوی

اے امیرِ نامور اے خسروِ عالی وقار — صدرِ بزمِ عارفاں، ملکِ سخن کے شہریار
علم و عرفاں کا ہے تو دریائے ناپیدا کنار — حکمت و دانش کو تیری ذات پر ہے افتخار
تیرا ثانی کم ہی دیکھے گی یہ دنیا اب کہیں
"عمرہا باید کہ تا خسرو بروزگار آید چنیں"

گرم ہے تیرے نفس سے محفلِ شعر و سخن — شاعروں کی مجلسوں میں تو ہے صدرِ انجمن
زمزموں میں ہے ترے وہ طرفگی و بانکپن — دم بخود ہے جن کو سن کر طوطیِ شکرشکن
چہکے بلبل کیا تری رنگیں بیانی دیکھ کر
خوش نوائی، نغز گوئی، نغمہ خوانی دیکھ کر

جملہ اصنافِ سخن پر ہے ترا انعام عام — مرثیہ، قطعہ، رباعی میں ہے نامی تیرا نام
انوری کا تجھ کو حاصل ہے قصیدہ میں مقام — عطر آگیں ہے غزل سے تیری سعدی کا مشام
تیرا خمسہ جو نظامی کے ہے خمسہ کا جواب
آج تک ہے بے ہمال و لاعدیل و لاجواب

ہر پہیلی ہے تری طبعِ رسا کا شاہکار — تیرے دو سخنے ہیں گویا زعفراں کے کشت زار
تیری انملیاں دکھاتی ہیں جدا اپنی بہار — کہہ مکرنی کا تری کہہ کر مکرنا ہے شعار
کس قدر دلچسپ ہے پنگھٹ پہ تیرا وہ ڈھول
جس میں باہم ہیں جتن سے چرخا، کتا، کھیر، ڈھول

مرثیہ قاآن کا تو نے لکھا وہ درد ناک قلبِ بلبن ہوگیا فرطِ الم سے چاک چاک
پھاڑ کر جیب و گریباں ڈالی فرق و رخ پہ خاک ہوگیا آخر جواں فرزند کے غم میں ہلاک
واہ وا گفتار میں تیری اثر کا یہ کمال
راست تو یہ ہے اسی کا نام ہے سحرِ حلال

شاعری پر تیری کیوں نازاں نہ ہو ہندوستاں ذات سامی ہے تری معروف و مشہورِ جہاں
مستند اس درجہ تیری فارسی ہے بے گماں لیتے ہیں اشعار سے تیرے سند اہلِ زباں
مرزا غالبؔ جو کسی ہندی کا قائل ہی نہیں
خاک پر گھستا ہے تیرے روبرو لوحِ جبیں

تو نے فلک ہند میں اردو کی ڈالی داغ بیل فارسی، ہندی کا آپس میں کرایا خوب میل
ابتدا میں شغل تیرا گو نظر آتا تھا کھیل لیکن آخر میں منڈھے چڑھ ہی گئی بولی کی بیل
ہندوی و ریختہ بنتی ہوئی اردو بنی
جو کرے ہر قلب کو تسخیر وہ جادو بنی

گائکی کے فن میں اپنے عہد کا ہے تو امام مطربان دہر لیتے ہیں ادب سے تیرا نام
اللہ اللہ قصرِ موسیقی میں تیرا یہ مقام راگنی لونڈی ہے تیری راگ ہے تیرا غلام
تا ابد بھی تیرے آگے بار پا سکتا نہیں
تان کوئی تان سین اپنی لگا سکتا نہیں

مختلف آلات موسیقی ہیں تیری یادگار تیری ہی ایجاد کا ثمرہ ہے طبلہ اور ستار
آئی تیری سعی سے نغمہ نوازی میں بہار تیرے ممنون کرم ہیں مطربانِ روزگار
سرنگوں تھے راگ کے طائر جو فرشِ خاک پر
پر سے سَم اور تال کے اڑنے لگے افلاک پر

سینۂ شفاف تیرا "مخزنِ اسرار" ہے روحِ جاں افروز تیرا مطلعِ انوار ہے
قلب تیرا نورِ ایماں سے تجلی زار ہے چشم تیری بادۂ دیدار سے سرشار ہے
نورِ حق سے سر بسر معمور ہے تیرا دماغ
خانۂ عرفاں کا تو ہے ایک تابندہ چراغ

گوناگوں اوصاف کا ہے ذات میں تیری قرآں　　فقر کا انداز ہے شانِ امارت سے عیاں
مرحبا یہ عشرت و عسرت کا دوگونہ سماں　　دلقِ درویشی بھی ہے ملبوس شاہی میں نہاں
بارگاہوں میں کبھی شاہوں کا تو دمساز ہے
خانقاہوں میں کبھی ولیوں کا تو ہمراز ہے

جب ہوئی صحبت نظام الدین کی تجھکو نصیب　　جاگ اٹھے برکت سے انکی تیرے خوابیدہ نصیب
رفتہ رفتہ ہو گیا مرشد سے تو اتنا قریب　　تجھ کو محبوب الٰہی نے کہا اپنا حبیب
شیر و شکر پھر توں مطلوب اور طالب ہوئے
اہل باطن کہہ اٹھے یکجان دو قالب ہوئے

جرأت وہمت یہ تیری حبذا صلِّ علیٰ　　دین کی خدمت بھی کی دنیا سے مطلب بھی رکھا
معرفت کی راہ میں ہر مرحلہ بھی طے کیا　　شغل میں تصنیف کے بھی محو روز و شب رہا
کام لے کر آخر اپنے خسروی اعجاز سے
لکھے ملفوظاتِ مرشد دل ربا انداز سے

بزم اہل حال میں ہوتا ہے جب تو نغمہ زن　　وجد کے عالم میں آجاتی ہے ساری انجمن
نشہ ہوجاتا ہے دنیا کی محبت کا ہرن　　دل کو لگ جاتی ہے معشوقِ حقیقی کی لگن
تیرا نغمہ اس لئے تاثیر سے خالی نہیں
شرع کے حلقہ سے باہر تیری قوالی نہیں

الفت پیر طریقت میں نہ تھا تیرا جواب　　مرگ مرشد کی خبر سن کر نہ آئی تجھ کو تاب
چل کے بنگالہ سے پہنچا شہر دہلی میں شتاب　　تربت محبوب پر گریاں رہا مثلِ سحاب
چھ مہینے شور و شیون کر کے ساکت ہو گیا
چادر خاکی میں اپنا منہ چھپا کر سو گیا

مصوّر سبزواری

یہ کون شمعِ تصوّف جلا کے چھوڑ گیا
کہ جگمگا گئی شاموں کو شامِ پٹیالی

دیا تو ایک سرِ رہگذر جلا تھا مگر
سمیٹ لایا تھا صدیوں کی دیوالی

مہک مہک گئے تاریخ کے ورق جس سے
نہ تھا وہ ظلِّ سلاطینِ تغلق و خلجی

وہ کوئی نکہتِ بے قید بوئے آوارہ
چلی تو ساری ہوائیں بنا دیں سودائی

چراغِ گل کہ گل روشنی کہو اُس کو
وہ رنگ و نور ہی اک دن امیرِ خسرو بنا

رہِ سلوک و طریقت میں اس کا پہلا قدم
تمام بیتی ہوئی منزلوں سے آگے تھا

جو دن میں بنتا تھا عکسِ جلالِ سلطانی
وہ شب میں گیسوئے سلطان الاولیا بھی رہا

بایں جمالِ بصیرت بہ حُسنِ دامنِ شوق
بہت کٹھن تھی ڈگر اس کے حق میں پنگھٹ کی

اسی حبیب کی خاطر کئے تھے سولہ سنگھار
اسی نظام نے رکھی تھی لاج گھونگٹ کی

وہ شاعری تھی کہ شیراز و اصفہان کا دل
جبینِ ہند پہ سجدے ہیں اہلِ فارس کے

وہ ہندی دوہے پہیلی وہ کہہ مکرنی کا فن
ہزار جھانکتے آنچل سے چاند ماوس کے

وہ بھیرویں وہ حسیں راگنی وہ سُر سرگم
کہ رستے دھارے گلے سے نکلتے سب رس کے

کلام چارۂ سفّاکیٔ جہاں اس کا
خموشی پردۂ دشتِ سکونِ جاں اُس کا

حریمِ نیم شبی میں وہ شعلۂ آواز
نوائے سوزِ جگر شمع اور دھواں اس کا

ادبِ تصوّف و نغمہ یہ احترام کریں
کہ آستانۂ خسرو کو سب سلام کریں

وہ ترکستان کے لاچینی قبیلہ کا دُریکتا — بلخ کی دل کشا بستی ہزارہ میں ہوا پیدا

تھا نام اُس کا امیر سیف الدین محمود نیک اختر — سیاست میں، تدبّر میں نہ تھا اس کا کوئی ہمسر

بہالایا اسے ہندوستاں میں سیل تاتاری — سکونت کو ضلع ایٹہ میں پٹیالی پسند آئی

یہ شمس الدین التمش کا دورِ حکمرانی تھا — یہ دور اہلِ ہنر کے حق میں دورِ دُرفشانی تھا

ہوا اس کے تدبّر کا جو چرچا بزمِ یاراں میں — رسائی ہو گئی موصوف کی دربارِ سلطاں میں

مِلا سلطانِ عالیجاہ کو جب گوہرِ یکتا — لیا دامانِ رحمت میں بڑھایا مرتبہ اس کا

مدد کی ہر طرح سلطاں کی توسیعِ ریاست میں — ترقی مملکت نے خوب کی اس کی معیت میں

ولیٔ باصفا حضرت عماد الملک کی دختر — امیر سیف الدین کے عقد میں آئی جواں ہو کر

ہوئے اس کے بطن سے تین لڑکے نیک خو پیدا — وہ عزّ الدین، یمین الدین، حسام الدین گلِ رعنا

ہوئے پیدا یمین الدین چھ سو اکاون میں — مطابق عیسوی سن کے وہ بارہ سو ترپن میں

محلہ میں قریب ان کے کوئی مجذوب رہتے تھے — جناب سیف اس ہستی سے بیحد انس رکھتے تھے

ہوئے پیدا یمین الدین تو ان کو گود میں لے کر — چلے حضرت کی خدمت میں دعائے خیر کی خاطر

لیا آغوش میں، دے کر دعائے خیر فرمایا — "یہ خاقانی سے آگے شاعری میں دو قدم ہوگا"

یہی بچّہ، یمین الدین، امیر خسرو کہلایا — سخن گوئی و موسیقی میں اعلیٰ مرتبہ پایا

تھے چار ہی سال کے خسرو کہ انکے والدِ اطہر — پئے تعلیم اپنے ساتھ دہلی لے گئے آکر

طلب کے ساتھ ہی ذوقِ حصولِ علم تھا کامل — اسی باعث اوائل عمر ہی میں ہو گئے فاضل

شغف تھا شعر و موسیقی سے زیادہ فطرتاً ان کو — کہے اشعار موزوں سات سالہ عمر میں دیکھو

ابھی نو سال ہی کے تھے کہ والد نے لڑائی میں — بڑی مردانگی سے جان دی شہ کی حمایت میں

عمادالملک نے لی اپنے ذمہ تربیت ان کی
یہاں حضرت نظام الدین کی صحبت ملی ان کو
عمادالملک بارہ سو تہتر میں ہوئے واصل
وہ ہمدرد مساکین، منکسر، صوفی منش خسرو
رفاقت میں، حمایت میں، سخاوت میں مروّتمیں
خوش اخلاقی وہمدردی مساوات وصلح جوئی
ان اوصاف حمیدہ سے رہا متصف ایدل
انھیں اوصاف کے باعث امیروشاہ وشہزادے
رہے دو سال تک خسرو ملک چھجّو کے درباری
کیا بارہ سو چوراسی میں منگولوں نے اک حملہ
محمد کی شہادت پر لکھا اک مرثیہ ایسا
پھراس کے بعد سرجاندار نے ان کو بلا بھیجا
اسی کے نام پر تخلیق کی ہے اسپ نامہ کی
ہوا رونق فزا جب کیقباد اورنگ شاہی پر
نوازش کی، ملک الشعر کا بخشا خطاب ان کو
وزاں پس قتل کیقباد، شمس الدین کیمورث
مربی وا تالیقی میں اس کمبخت کو لے کر
دیا خسرو کو اس نے پہلے مصحف دار کا عہدہ
جلال الدین کے جنگی کارناموں پر یہ چھوٹی سی
ہے جسکی حیثیت اب تک بھی تاریخ وسیاست میں
علاؤالدین وقطب الدین مبارک شاہ نے پیہم
دلیلِ بے ضمیری پیشۂ درباردار تھا
نظر دربار کے ماحول پر رکھتے تھے اکثر
انھیں الفت تھی ہردم زیست کے اقتدار اعلیٰ سے

علوم ظاہری کے ساتھ دی تعلیم باطن بھی
بالآخر بیعت کرکے دیدیا دل پیر کامل کو
اوراس کے بعد خسرو کو ہوئی فکر معاش ایدل
تعصب سے بری، حضرت نظام الدینؒ کے پیرو
وہ یکتائے زمانہ تھے شجاعت میں، سیاست میں
ذہانت، دینداری، بذلہ سنجی، نغمہ آرائی
عوام وخاص میں ہوتی نہ کیوں مقبولیت حاصل
مصاحب، میر خسرو کو بنا لینے کے خواہاں تھے
کرلی، بعداس کے بغرا، محمد کی مصحف داری
شہادت پائی شہزادہ محمد نے سبحان اللہ
ہوا جس کا جہانِ علم وفن میں ہرطرف چرچا
بڑھائی عزت وحرمت، ندیم خاص فرمایا
نقید المثل یہ تصنیف ہے اپنے زمانہ کی
لکھائی "قران السعدین" مثنوی خسرو سے خوش ہوکر
ندیم خاص فرمایا، نوازا بے حساب ان کو
برائے نام تھا سلطان وتخت وتاج کا وارث
جلال الدین خلجی نے سنبھالا اقتدار آخر
پھراس کے بعد امارت دے کے اونچا کردیا درجہ
لکھی ہے مثنوی خسرو نے مفتاح الفتوح ایسی
ادب میں خوب تر ہے یہ تولاثانی صداقت میں
جناب میر خسرو کی رکھی وہ حیثیت قائم
ملی عزت کہ خسرو کا رویہ بردباری تھا
نہ تھے وابستگئ یک رخہ کے قائل وخوگر
اسی باعث تو ان کی زندگانی میں تنوع ہے

رکھی شاہانِ دہلی نے عنایت کی نظران پر — وجہ یہ تھی کہ وہ پہچانتے تھے شاہ کے تیور
نہ رکھتے تھے کبھی باہر قدم حدِ امارت سے — ابھرنا جانتے تھے ڈوب کر بحرِ سیاست میں
بظاہر منہمک دربارداری بس رہے خسرو — مگر تھے اصل میں وہ معرفت کی راہ کے رہرو
سلاطین کو فرائض سے کیا کرتے تھے وہ آگاہ — نمائندہ تھے وہ حضرت نظام الدین کے درگاہ
سلاطیں سے عوام الناس کی حاجت روائی کو — روا مرشد کے کہنے پر رکھا مدحت سرائی کو
مشن حضرت نظام الدین کا پورا کیا جس نے — سلاطین کو غریبوں کا کیا حاجت روا جس نے
بہت ہی ناز تھا حضرت کو ان کی ذات والا پر — بہت مسرور ہو ہو کر کہا کرتے تھے اکثر
جو پوچھے گا خدا روزِ جزا لایا ہے کیا تحفہ — تو کہہ دوں گا یہ خسرو ہے مرے اعمال کا ثمرہ
ہوئی تیرہ سو پچیس میں نظام الدینؒ کی رحلت — سیہ پوشی میاں خسرو کی آخر ہو گئی قسمت
نہ تھی تابِ جدائی چھ مہینہ بعد ہی آخر — چلا سوئے عدم وہ فارسی کا بے بدل شاعر
تھی ان کو جملہ اصنافِ سخن پر دسترس حاصل — مگر غزلیں ہیں ان کی بے پناہ تاثیر کی حامل
زباں ہے مستند، طرزِ ادا ہے دلکش و زیبا — سلاست اور روانی میں ہیں اک بہتا ہوا دریا
کلام حیران کن شہ کار ہے اوجِ تخیل کا — جسے پڑھ کر پتہ چلتا ہے معراجِ تعقل کا
فقط وہ فارسی کے ہی نہیں تھے شاعرِ خوش گو — وہ ہیں اردو کے خالق اور پہلے شاعرِ پرگو
کریں ہم جس قدر بھی ناز ان کی ذات والا پر — بجا ہے، راست ہے، زیبا ہے اے مرغوب نیک اختر

سلام اے طوطیٔ ہندوستاں اے شاعرِ خوش گو
سلام اے خسروِ ملک صفا، اسلام کے پیرو

قائم شدہ - ۱۹۱۳
فون نمبر - ۲۶۳۰۸۰
راجدھانی میں مغلئی کھانوں کا مرکز
کریم ہوٹل
مرغ مسلم، مچھلی، قورمہ، نرگسی کوفتہ
تندوری
مرغ
برہ کباب، سیخ کباب
شامی کباب،
قورمہ، اسٹو، پسندہ، بریانی،
مینجر کریم ہوٹل - جامع مسجد، دہلی ۶

Punjab Wakf Board's Publication

The AUKAF Quarterly

50, Sardar Patel Marg, AMBALA Cantt.